شعری اصناف تعارف و تفہیم حصہ اوّل

سیکنڈ سمسٹر بی ایس۔ اردو

ترتیب: وہاب اعجاز خان

گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج بنوں

فہرست

شعر

شعر کے لغوی معنی ہیں جاننا بوجھنا۔ شعر کی چند تعریفیں درجِ ذیل ہیں

شعر ایسا کلام ہے جو موزوں اور مقفیٰ ہو۔

جو جذبات الفاظ کے ذریعے ادا ہوں، شعر ہیں۔

کلامِ موزوں شعر ہے۔

شاعری موزوں اور پُر ترنم الفاظ میں دلی جذبات کا اظہار ہے۔

درجِ بالا تعریفوں سے شعر کی کوئی حتمی تعریف تو ممکن نہیں لیکن یہ ضرور پتہ چلتا ہے۔ کہ شاعری کے لیے موزوں الفاظ، قافیے اور جذبات کا دلی اظہار ہی بنیادی شرائط ہیں۔ لیکن الفاظ کا وزن میں استعمال ہی شاعری کے لیے بنیادی شرط ہے۔ اور اس کی مدد سے نظم اور نثر میں تفریق ممکن ہے۔

وزن کے لغوی معنی "اندازہ" اور "پیمانہ" کے ہیں مگر اصطلاح میں اس سے مراد ہے علمِ عروض کی مقررہ بحروں میں سے کسی بحر کی میزان پر تولنا وزن کہلاتا ہے۔

بحر کے لغوی معنی سمندر یا دریا کے ہیں۔ مگر اصطلاح میں بحر چند ایسے کلماتِ موزوں کا نام ہے جن پر اشعار کا وزن ٹھیک کیا جاتا ہے۔ بحر جن اجزا (ٹکڑوں) سے بنتی ہے، اُن کو ارکان کہتے ہیں۔

فعولن۔ فعولن۔ فعولن۔ فعولن

تقطیع کے لغوی معنی ہیں ٹکڑے ٹکڑے کرنا۔ جب کسی شعر کے اجزاء کو بحر کے ارکان پر وزن کر کے دیکھا جائے کہ وہ بحر کے مطابق ہے یا نہیں، تو اُسے تقطیع کہتے ہیں۔ وزن، بحر اور تقطیع کا فن علمِ عروض کہلاتا ہے۔

قافیہ: قافیہ، قفا سے نکلا ہے جس کے معنی پیچھے آنیوالے کے ہیں۔ اصطلاح میں چند حروف و حرکات کے اس مجموعے کو قافیہ کہتے ہیں، جس کی تکرار بہ الفاظِ مختلف، شعر یا مصرع کے آخر میں ردیف سے قبل آئے۔ ردیف، ردیف کے لغوی معنی ہیں گُھڑ سوار کے پیچھے بیٹھنے والا اصطلاح میں اس مستقل کلمے کو کہتے ہیں جو کسی شعر یا مصرعے کے آخر میں قافیہ کے بعد آتا ہے۔

نعت

نعت کے لغوی معنی وصف کے ہیں۔ خصوصاً جب آپ کسی چیز کے وصف میں مبالغہ سے کام لیں تو اُس وقت نعت کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ شاعری کی اصطلاح میں نعت وہ صنف نظم ہے جس میں رسول پاک ﷺ کی ذات، صفات، اخلاق اور شخصی حالات وغیرہ کا بیان ہوتا ہے اور آپؐ کی ہر حوالے سے مدح یعنی تعریف بیان کی جاتی ہے۔ نعت در حقیقت ایک مسلمان کی، حضور ﷺ کی ذاتِ اقدس سے والہانہ عقیدت و محبت کے اظہار کی ایک شکل ہے۔ آپ ﷺ کے فرمان کے مطابق آپؐ کی ذات سے ایک مسلمان کی محبت، دنیا کی تمام محبتوں اور تعلقات، بشمول والدین، عزیز رشتہ دار حتیٰ کہ اپنی جان تک سے محبت پر فائق ہونی چاہیے۔ اس اعتبار سے نعت کے سو رنگ اور سو مضمون ہوسکتے ہیں۔ موضوع کے اعتبار سے اس میں وسعت اور پھیلاؤ کی کوئی انتہا نہیں۔ دنیا کی کوئی بھی ایسی زبان، جس میں مسلمانوں نے شاعری کی ہو، نعت سے خالی نہیں۔ اردو شاعری میں حمد کی طرح نعت کی روایت بھی بڑی پختہ ہے۔

موضوع کی وسعت کے ساتھ ساتھ نعت کی کوئی مقررہ ہیئت بھی موجود نہیں۔ نعتیہ قصیدے، مثنوی، مسدس اور رباعی کے علاوہ آزاد نظم کی ہیئت میں بھی نعتیں لکھی گئی ہیں۔

ایک اچھے نعت گو کے لیے حمد اور نعت کے درمیان حدِ فاصل قائم رکھنا ضروری ہے۔ یہ ایک نازک مقام ہے اور اس کے لیے مہارتِ فن کی ضرورت ہے۔ پھر مبالغہ سے بچنا ضروری ہے۔ حضور ﷺ کی ذات گرامی سے کوئی ایسی صفت وابستہ نہ کی جائے جو صفتِ باری تعالیٰ ہو۔ مبادا شاعر کا دامن شرک سے آلودہ ہو۔ نعت گوئی کے بارے میں ضروری ہے کہ نعت رسماً نہ کہی گئی ہو بلکہ آپؐ سے والہانہ عقیدت اور شیفتگی اس کی بنیاد ہو۔ جہاں تک زبان و بیان کا تعلق ہے نعت گو کی زبان پاکیزہ اور الفاظ و تراکیب آپؐ کے مرتبے اور حیثیت کے مطابق ہونے چاہئیں اور اس کا لہجہ نرم، دھیما اور پُر سوز و پر تاثیر ہونا ضروری ہے۔

نعت کی ابتداء عربی زبان میں ہوئی۔ روایات کے مطابق سب سے پہلی نعت حضورؐ کے چچا ابو طالب نے کہی۔ عربی میں باقاعدہ نعت گوئی کے آغاز کے بعد حضرت حسان بن ثابتؓ اور حضرت عبد اللہ بن رواحہؓ جیسے نعت گو شعراء نے اپنی تمام تر شاعرانہ صلاحیتوں اور قوتوں کو حضورؐ کی مدح کے لیے وقف کر دیا۔ نعت گوئی کا یہ سلسلہ صحابہؓ کے دور سے لے کر اُموی اور عباسی دور میں بھی جاری رہا اور عربی زبان میں کئی بڑے نعت گو شعراء منظر عام پر آئے۔

عربوں کی فتح ایران کے بعد جب اسلام کی شعاعیں اس سر زمین پر پھیلیں تو فارسی شعر و ادب پر بھی اس کے اثرات پڑے۔ عربی کی طرح فارسی شعراء نے نعت کے محبوب مشغلے کو اختیار کیا۔ حکیم سنائی، خاقانی، نظامی گنجوی، رومی، عطار اور سعدی جیسے باکمال شاعروں نے فارسی نعت کی روایت کو آگے بڑھایا۔

ہندوستان میں نعت گوئی کی روایت کی ابتداء سندھی زبان میں ہوئی کیونکہ عربوں کے ذریعے پہلی مرتبہ اسلام کی شعاعوں نے سندھ کی سرزمین کو منور کیا۔ لیکن اردو میں نعت کی روایت فارسی کے ذریعے سے داخل ہوئی۔ ہندوستان سے تعلق رکھنے والے اولین فارسی گو شعراء خاص طور پر امیر خسرو کے ہاں نعت کے بہترین نمونے ملتے ہیں۔ شمالی ہند میں فارسی کا طوطی بول رہا تھا اور دکن و گجرات میں اردو زبان کی مقبولیت اور سرکاری سرپرستی نے اردو کی اہمیت میں اضافہ کر دیا۔ یوں بہمنی عہد اور بعد میں اس کے جانشین سلطنتوں کے زمانے میں یہ زبان بول چال کی سطح سے بلند ہو کر شعر و ادب اور تصنیف تالیف کی زبان بن گئی۔ پہلی مرتبہ صوفیائے کرام نے تبلیغ دین کے لیے اسی زبان کو استعمال کیا۔ اردو زبان میں نعت کے اولین نمونے بھی انہی صوفیائے کرام کے ہاں ملتے ہیں۔ اردو زبان کے پہلے نعت کا نمونہ حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے ہاں ملتا ہے۔ اس دور کے تمام صوفیا کے ہاں نعت کے نمونے کسی نہ کسی صورت میں دکھائی دیتے ہیں۔ جنوبی ہند میں بہمنی سلطنت کے زوال کے بعد قطب شاہی سلطنت کا قیام عمل میں آیا۔ جن کے حکمران نہ صرف خود تعلیم یافتہ تھے بلکہ علم و ادب کے فروغ سے بھی انتہائی دلچسپی رکھتے تھے۔ اردو کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر قلی قطب شاہ کے ہاں پانچ نعتیہ غزلیں ملتی ہیں۔ اس کے علاوہ قطب شاہی دور کے دیگر شعراء

ملاوجہی، عبداللہ قطب شاہ، ملاغواصی، طبعی اور نصرتی کی تخلیق کردہ مثنویوں میں بھی نعت کے بہترین نمونے ملتے ہیں۔ اردو شاعری کے باوا آدم ملاوجہی کے ہاں بھی نعت سے متعلق دو قصیدے ہیں۔

یا محمد دو جہاں کی عید ہے تجھ ذات سوں
خلق کوں لازم ہے جی کوں تجھ پہ قربانی کرے

ولیؔ کا دیوان شمالی ہند پہنچا اور یوں پہلی مرتبہ یہاں اردو شاعری کی ابتداء ہوئی۔ اردو شاعری کے عہد زریں میں سوداؔ نے بہترین نعتیہ قصائد تخلیق کیے۔

زمین و آسماں ہوں کیوں نہ روشن نور سے اس کے
کہ ہے اک پرتوِ خورشید مہتابِ محمد کا

اسی طرح میرؔ کی نعت میں دردمندی، اخلاص اور سوز گداز کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس کے علاوہ غلام ہمدانی مصحفی، حکیم مومن خان مومن کے بعد کرامت علی شہیدیؔ، مولانا کفایت علی کافیؔ، مولانا علی امام شہید، مولانا لطف بریلوی اور مولوی تمنامراد آبادی نے اردو نعت کی نئی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا۔ اس روایت کو امیر مینائی اور محسن کاکوروی نے تکمیل کے درجے پر پہنچا دیا۔

مسلمان شعراء کے علاوہ ہندو شعراء نے بھی بکثرت نعتیں کہی ہیں۔ ان میں کالیکا پرشاد، دیا شنکر نسیم اور کشن پرشاد شادؔ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ بعد کے آنے والے شعراء میں حالی، احمد رضا خان بریلوی، بیدم وارثی، ظفر علی خان، علامہ اقبال، اقبال سہیل، بہزاد لکھنوی، احسان دانش، حفیظ جالندھری، ماہر القادری، حفیظ تائب، مظفر وارثی، علیم ناصری، امین راحت چغتائی اور عبدالعزیز خالدؔ کا شمار نمایاں نعت گوؤں میں ہوتا ہے۔

مولانا احمد رضا خان

تعارف:

مولانا احمد رضا خان، اعلیٰ حضرت، امام اہلسنت، حسان الہند جیسے القابات سے جانے جاتے ہیں۔ احمد رضا خان 1272ھ-1856ء میں پیدا ہوئے۔ امام احمد رضا خان شمالی بھارت کے شہر بریلی کے ایک مشہور عالم دین تھے جن کا تعلق فقہ حنفی سے تھا۔ امام احمد رضا خان کی وجہ شہرت میں اہم آپ کی حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے محبت، آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی شان میں لکھے نعتیہ مجموعے اور آپ کے ہزارہا فتاوی کا ضخیم علمی مجموعہ جو 30 جلدوں پر مشتمل فتاوی رضویہ کے نام سے موسوم ہے۔ بر صغیر پاک و ہند میں اہلسنت کی ایک بڑی تعداد آپ ہی کی نسبت سے بریلوی کہلاتے ہیں۔

دینی علوم کی تکمیل گھر پر اپنے والد مولوی نقی علی خان سے کی۔ دو مرتبہ حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے۔ درس و تدریس کے علاوہ مختلف علوم و فنون پر کئی کتابیں اور رسائل تصنیف و تالیف کیے۔ قرآن کا اردو ترجمہ بھی کیا جو کنزالایمان کے نام سے مشہور ہے۔ علوم ریاضی و جفر میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ شعر و شاعری سے بھی لگاؤ تھا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی شان میں بہت سی نعتیں اور سلام لکھے ہیں۔ 25 صفر 1340ھ مطابق 1921ء کو بریلی میں انتقال کر گئے۔

نعت گوئی

نعتیہ دیوان حدائقِ بخشش تین جلدوں میں ہے، پہلے دو جلدیں آپ کی حیات میں اور تیسری، بعد از وفات جمع کر کے کلام شائع کیا گیا۔ مولانا محسن کاکوروی کے بعد اردو کے دوسرے بڑے نعت گو ہیں جنہوں نے اردو نعت کی ترویج و ارتقاء میں تاریخ ساز کام کیا۔ اردو نعت کی تاریخ میں اگر کسی فردِ واحد نے شعرائے نعت پر سب سے گہرے اثرات مرتب کیے ہیں تو وہ بلاشبہ مولانا احمد رضا کی ذات ہے۔ انہوں نے نہ صرف نعت گوئی کی طرف توجہ کی بلکہ اپنے ہم مسلک شاعروں، خلفاء میں نعت گوئی کو ایک تحریک کی شکل دی۔ اردو نعت میں بریلوی مکتبِ فکر سے تعلق رکھنے والے سینکڑوں شاعروں کے ذوق نعت کو مولانا ہی کی نعت گوئی سے جِلا ملی۔

وسیع مطالعہ:

مولانا کی نعت میں مختلف علوم کی علمی و فنی اصطلاحات کو خوبصورتی سے استعمال کیا گیا ہے۔ مولانا نے اپنے وسیع مطالعے کو تخلیقی انداز میں نعت گوئی کا جزو بنایا ہے۔ لیکن ان تمام تر علمی اصطلاحات کے باوجود ان کے کلام میں زورِ بیان موجود ہے۔ جس کی بدولت تمام تر ثقیل علمی اصطلاحات کے باوجود نعت میں فطری خوبصورتی اور بہاؤ برقرار رہتا ہے۔

محیط و مرکز میں فرق مشکل رہے ز فاصل خطوط واصل
کمانیں حیرت سے سر جھکائے عجیب چکر میں دائرے ہیں

قرآن و احادیث:

مولانا نے بعض جگہ قرآن مجید اور حدیث نبویؐ کے حوالوں کو ایک ہی شعر اور کہیں کہیں ایک ہی مصرع میں یکجا کر دیا ہے۔ انہوں نے اپنی نعت کی خوبصورتی کے لیے قرآن و حدیث کے حوالوں کو تخلیقی شعور سے استعمال کیا ہے اور اپنی نعت میں ہر ممکن خوبصورتی پیدا کی ہے۔

لَیلَۃ القدر میں مطلعِ الفجر حق
مانگ کی استقامت پہ لاکھوں سلام

فنی محاسن:

مولانا کی نعت میں تشبیہ، استعارہ، مجاز مرسل، حسن تعلیل اور مراعاۃ النظیر کے عمدہ نمونے ملتے ہیں۔ انہوں نے اپنی شاعری میں عربی فارسی کے الفاظ کا بھی بخوبی استعمال کیا ہے۔ جبکہ انہوں نے اردو محاورے کو بھی نعت کے اشعار میں خوبصورت انداز میں باندھا ہے۔ ان میں کلمہ پڑھنا، صدقہ لینا، ستارہ چمکنا، بول بالا ہونا۔ کلیجہ ٹھنڈا ہونا جیسے محاورے شامل ہیں۔

صبح طیبہ میں ہوئی بٹتا ہے باڑا نور کا
صدقہ لینے نور کا آیا ہے تارا نور کا

مولانا کے ہاں پر شکوہ الفاظ و تراکیب اور بہترین صوتی ہم آہنگی اور موسیقیت کے نمونے بھی ملتے ہیں:

بصالتِ کل ، امامت کل ،سیادت کل ، امارت کل
حکومتِ کل ، ولایتِ کل ، خدا کے یہاں تمہارے لیے

عشقِ رسول:

عشق رسول کا جذبہ ہر بڑے نعت گو کے کلام میں نظر آتا ہے لیکن مولانا کی نعت میں عشقِ رسول اکرم کی وارفتگی بہت زیادہ ہے۔ ان کی نعت محبتِ رسول کا مظہر ہے۔ لیکن اس عقیدت اور محبت کے باوجود مولانا کی نعت گوئی میں آدابِ شرعیہ کو ہمیشہ ملحوظ رکھا گیا ہے۔ ان کی نعتوں میں اللہ اور نبی کے فرق کو کہیں گڈمڈ نہیں ہونے دیا گیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مولانا نے اعلیٰ اور معیاری نعتیں تخلیق کیں اور ان کے زیر اثر نعت کے ایک منفرد دبستان کی تشکیل ہوئی۔ اور عاشقانِ رسول کے لیے آج بھی ان کا کلام بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

منتخب نعت کی تشریح

مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام
شمعِ بزمِ ہدایت پہ لاکھوں سلام

فرہنگ: (مصطفیٰ) چنا ہوا، منتخب (بزم ہدایت) رہنمائی کی مجلس مراد انبیائے کرام (جانِ رحمت) سراپا مہربان

تشریح: یہ مولانا احمد رضا بریلوی کے مشہور نعتیہ سلام کا پہلا شعر ہے۔ اِسے میلاد شریف کی محفلوں، جلسوں اور مسجدوں میں عام پڑھا جاتا ہے۔ اس سلام کے کل اشعار کی تعداد ایک سو ستر ہے۔

مولانا احمد رضا خان فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جو رحمت کی روح اور مغز ہیں آپؐ پر لاکھوں مرتبہ درود اور سلام ہو کیوں کہ ایسا کرنے کا اللہ تعالیٰ نے بھی باقاعدہ حکم دیا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے:

"بے شک اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے رحمت (درود) بھیجتے ہیں ان پیغمبرؐ پر۔ اے ایمان والو تم بھی آپؐ پر رحمت بھیجا کرو اور خوب سلام بھیجا کرو۔"

اگلے مصرعے میں شاعر فرماتے ہیں کہ آپؐ ہدایت کی محفل کے چراغ ہیں۔ یعنی تمام انبیاء کرام میں سب سے افضل شخصیت حضورؐ کی ہے۔ آپ پر لاکھوں درود اور سلام ہوں۔

مہرِ چرخِ نبوت پہ روشن درود
گلِ باغِ رسالت پہ لاکھوں سلام

فرہنگ: (مہر) سورج (چرخ) آسمان (گلِ باغِ رسالت) نبوت و پیغمبری کے باغ کا پھول

تشریح: مولانا احمد رضا خان بریلوی نعتیہ سلام کے اس شعر میں عشق اور عقیدت میں ڈوبی اس خواہش کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ آپؐ نبوت کے آسمان پر سورج کی طرح چمک رہے ہیں اس لیے میرے دل کے روشن اور پُر نور درود آپؐ تک پہنچیں۔ آپؐ رسالت کے باغ کا مہکتا پھول ہیں اس لیے میرے لاکھوں سلام آپؐ کی نذر ہیں۔

شہر یارِ ارم ، تاجدارِ حرم
نو بہارِ شفاعت پہ لاکھوں سلام

فرہنگ: (شہر یارِ ارم) جنت کے بادشاہ (تاج دارِ حرم) کعبے کے بادشاہ (نو بہار) نئی رونق (شفاعت) گناہوں کی معافی کی سفارش

تشریح: مولانا احمد رضا خان اس شعر میں فرماتے ہیں کہ آپؐ جنت کے بادشاہ ہیں کیوں کہ آپؐ نے خود فرمایا کہ "جب تک جنت میں، میں داخل نہ ہو جاؤں جنت دوسروں پر حرام ہے۔" آپؐ خانۂ کعبہ کے بھی حاکم ہیں آپ کی دنیا میں آمد سے ایسی نئی بہار آئی جس سے اُمت کو اللہ تعالیٰ کے سامنے سفارش کا ذریعہ میسر آیا ورنہ حشر کے میدان میں جہاں کوئی اپنی سفارش نہیں کر سکے گا وہاں دوسروں کی سفارش کوئی کیا کر سکے گا۔ اُس ذاتِ بابرکات پر لاکھوں سلام

جس کے ماتھے شفاعت کا سہرا رہا
اُس جبینِ سعادت پہ لاکھوں سلام

فرہنگ: (جبینِ سعادت) نیک بختی کی پیشانی

تشریح: مولانا احمد رضا اس شعر میں فرماتے ہیں کہ تمام انسانوں، تمام اولیاء، تمام صلحاء، تمام اصحابِ رسول اور تمام انبیاء میں یہ سعادت صرف اور صرف آپؐ کے حصے میں آئی کہ آپؐ کے مبارک ماتھے پر اللہ تعالیٰ کے نزدیک دوسروں کی گناہوں سے بخشش اور جہنم کے عذاب سے نجات پانے کی سفارش کا سہرا باندھا گیا۔ آپؐ کے خوش بخت ماتھے پر لاکھوں درود و سلام ہوں

کاش محشر میں جب اُن کی آمد ہو اور
بھیجیں سب اُن کی شوکت پہ لاکھوں سلام

فرہنگ: (کاش) خدا کرے ایسا ہی ہو (محشر) قیامت / میدانِ محشر / حساب کتاب کا دن (آمد) آنا.. (شوکت) دبدبہ / شان و عظمت

تشریح: اس شعر میں مولانا احمد رضا خان صاحب اس دعائیہ خواہش کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ کاش! ایسا ہو کہ جب قیامت کا دن ہو اسرافیلؑ کا صور پھونکنے سے سب مردے اپنی اپنی قبروں سے نکل کر حشر کے میدان کی جانب بھاگ رہے ہوں ایسے میں جب آپؐ کی میدانِ حشر میں آمد کا شور بلند ہو تو آپؐ کی عظمت اور شان دیکھ کر وہاں موجود سب افراد آپؐ پر درود اور سلام پڑھنے لگ جائیں آپؐ کے بلند مرتبے اور عظیم رُتبے کو دیکھ کر تو لگتا ہے کہ یقیناً ایسا ہی ہو گا۔

مولانا ظفر علی خان

مولانا ظفر علی خان 19 جنوری، 1873ء میں کوٹ میرٹھ شہر وزیر آباد میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے اپنی ابتدائی تعلیم مشن ہائی اسکول وزیر آباد سے مکمل کی اور گریجویشن علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے کی۔ 1908ء میں لاہور آئے، روزنامہ زمیندار کی ادارت سنبھالی جسے ان کے والد مولوی سراج الدین احمد نے 1903ء میں شروع کیا تھا۔ مولانا کو "اردو صحافت کا امام" کہا جاتا ہے اور زمیندار ایک موقع پر پنجاب کا سب سے اہم اخبار بن گیا تھا۔ زمیندار ایک اردو اخبار تھا جو بطور خاص مسلمانوں کے لیے نکالا گیا تھا۔ اس اخبار نے مسلمانوں کی بیداری اور ان کے سیاسی شعور کی تربیت کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ مولانا ظفر علی خان غیر معمولی قابلیت کے حامل خطیب اور استثنائی معیار کے انشا پرداز تھے۔ صحافت کی شاندار قابلیت کے ساتھ ساتھ مولانا ظفر علی خان شاعری کے بے مثال تحفہ سے بھی مالا مال تھے۔ ان کی نظمیں مذہبی اور سیاسی نکتہ نظر سے بہترین کاوشیں کہلاتی ہیں۔ وہ اسلام کے سچے شیدائی، محب رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور اپنی نعت گوئی کے لیے مشہور و معروف ہیں۔ ان کی شاعرانہ کاوشیں بہارستان، نگارستان اور چمنستان کی شکل میں چھپ چکی ہیں۔ مولانا ظفر علی خان نے 27 نومبر، 1956ء کو وزیر آباد کے قریب اپنے آبائی شہر کرم آباد میں وفات پائی۔

نعت گوئی

مولانا ظفر علی خان کی نعت میں عشق رسول کے ساتھ ساتھ اُن کا سیاسی شعور بھی منفرد نوعیت کا حامل ہے۔ مولانا ظفر علی خان کے نعتیہ کلام میں ہندی مسلمانوں کی کسمپرسی، عالم اسلام کی بدحالی، طرابلس پر اٹلی کا حملہ، تحریکِ خلافت، تحریک عدم تعاون، تحریک ہجرت اور اس دور میں رونما ہونے والے مسلم کش فسادات کے اثرات ملتے ہیں۔ انہوں نے اپنی نعتوں کے ذریعے سے مدح رسول کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی اصلاح اور اتحاد کا کام لیا۔ ان کی نعتوں میں ایک التجائی کیفیت نظر آتی ہے۔ جس میں وہ امت کو اس مشکل دور سے نکالنے کے لیے حضورؐ کے آگے فریاد کناں نظر آتے ہیں۔

موردِ لطف و خاص پر کس لیے آج یہ عتاب
ہم سے پھرا ہے آج کیوں گوشۂ چشمِ التفات

تعلیماتِ نبوی:

ظفر علی خان کی نعت کا دوسرا بڑا عنصر تعلیماتِ نبوی کا بیان ہے۔ مولانا نے نعت کو اصلاح اور تبلیغ کا ذریعہ بنایا۔ اُن کی نعت گوئی عشق رسول کا اظہار تو ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ حضورؐ کی تعلیمات اور ارشادات کی بھی آئینہ دار ہے۔

برسا ہے شرق و غرب پہ ابرِ کرم ترا
آدم کی نسل پر ترے احساں ہیں بے حساب
پیدا ہوئی نہ تیری مواخات کی نظیر
لایا نہ کوئی تیری مساوات کا جواب

اسوۂ حسنہ:

مولانا کی نعت کا مقصد قارئین کو حضور اکرمؐ کے کردار سے روشناس کرانا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا نے اپنی نعت میں معجزات کی بجائے حضورؐ کے روزمرہ کے واقعات اور اُن کے کردار و عمل کے بشری پہلوؤں پر زیادہ زور دیا ہے۔ ان کے نزدیک حضورؐ کی ذات مشرق و مغرب کے لیے رحمت اللعالمین تھے۔

عرب کے واسطے رحمت ، عجم کے واسطے رحمت
وہ آیا ، لیکن آیا رحمت اللعالمیں ہو کر

ختم نبوت:

مولانا ظفر علی خان نے اپنے کلام میں جن واقعات و مسائل کا ذکر کیا ہے۔ اُن میں ایک ختم رسالت کا مسئلہ بھی ہے۔ مرزا غلام احمد قادیانی کے نبوت کے دعویٰ کے خلاف جن مسلمان اکابرین نے بروقت ردعمل کا بھرپور اظہار کیا۔ اُن میں ظفر علی خان ہمیشہ پیش پیش رہے۔

خدا نے تم کو بصیرت اگر عطا کی ہے
تو قادیانیوں کے تیر بے کماں سے بچو
کبھی حج ہو گیا ساقط ، کبھی قیدِ جہاد اُٹھی
شریعت قادیان کی ہے ، رضا جوئی نصاریٰ کی

نعت(تشریح)

دل جس سے زندہ ہے وہ تمنا تمہی تو ہو
ہم جس میں بس رہے ہیں وہ دنیا تمہی تو ہو

تشریح: اس شعر میں مولانا ظفر علی خان نے حضورؐ کو اپنی تمنا یعنی خواہش قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک کسی بھی مسلمان کے لیے مال و دولت اور اولاد کی محبت سے زیادہ مقدم حضورؐ کی ذات ہے۔ اس لیے شاعر حضورؐ کی محبت کے بغیر زندہ رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ شاعر کے نزدیک میرے دل میں جینے کی آس صرف اور صرف آپؐ کی ذاتِ بابرکات کی بدولت ہے اور ان ہی کی ذات ہمارے لیے سب کچھ ہے۔

مجھ پُر خطا کی لاج تمہارے ہی ہاتھ ہے
مجھ ننگ دو جہاں کا وسیلہ تمہی تو ہو

تشریح: اس شعر میں ظفر علی خان انسانی کمزوریوں کا ذکر کرتے ہیں۔ کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان فطرتاً خطاؤں سے بنا ہے لیکن ہم جیسے گناہ گار انسان کی عزت تیرےؐ ہی ہاتھوں میں ہے۔ کیونکہ تیری سفارش کے بغیر دوزخ ہی ہمارا آخری ٹھکانہ ہو سکتا ہے ایسے میں اپنے اس امتی کی لاج یعنی عزت تیرے ہاتھ میں ہے۔ دوسرے مصرعے میں فانی زندگی میں انسان کی خطاؤں کے سبب اس کی دائمی زندگی کی بربادی کا ذکر کیا گیا ہے۔ یعنی بقول شاعر اس دنیا میں ہمارے اعمال ہر گز ایسے نہیں جن کی بدولت آخرت کے دن ہماری مغفرت ممکن ہو پائے۔ بس ہمارے پاس حضورؐ کی ذات ہی ایک ایسا وسیلہ یعنی ذریعہ ہے جو کہ ہماری تمام خطاؤں کے باوجود اللہ کے سامنے ہماری شفاعت ضرور کریں گے۔

جلتے ہیں جبرائیل کے پر جس مقام پر
اس کی حقیقتوں کے شناسا تمہی تو ہو

اس شعر میں مولانا ظفر علی خان نے حضورؐ کی عظمت بیان کی ہے۔ اور سلسلے میں انہوں نے واقعہ معراج کی طرف اشارہ کیا ہے۔ شاعر کے نزدیک حضورؐ کی شخصیت تمام انسانوں سے اور ملائکہ سے افضل ترین ہے کیونکہ ان کی رسائی عرش معلیٰ تک ہے جہاں پر جبریل جیسے برگزیدہ فرشتے کے پر بھی جلنے لگتے

ہیں۔ شاعر کے نزدیک حضورؐ کی شخصیت مخلوقات میں وہ واحد شخصیت ہے جس نے محبوب حقیقی کا نزدیک سے مشاہدہ کیا ہے اور انہیں وہ کائناتی حقیقتیں معلوم ہیں جو اللہ نے کسی اور پر منکشف نہیں کیں۔

جو دستگیر ہے وہ تمہارا ہی ہاتھ ہے
جو ڈوبنے نہ دے وہ سہارا تمہی تو ہو

تشریح: ظفر علی خان کے خیال میں انسان دنیاوی عیش و عشرت میں ڈوب کر ہمیشہ اللہ کے راستے سے دور ہٹ جاتا ہے۔ گناہوں میں ڈوبے ہوئے ایسے انسانوں کا واحد سہارا حضورؐ کی ذات ہیں جن کی شخصیت اور تعلیمات کسی بھی گناہوں میں ڈوبتے شخص کے لیے مددگار کا کردار ادا کرتی ہے۔ اگر حضورؐ کی ذات مبارک کا سہارا نہ ہوتا تو شاید انسانیت گناہوں میں ڈوب کر خود کو برباد کر ڈالتی۔

سب کچھ تمہارے واسطے پیدا کیا گیا
سب غایتوں کی غایتِ اُولٰی تمہی تو ہو

ظفر علی خان کے نزدیک تمام مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ کائنات کی تخلیق کا سبب ہی صرف حضورؐ کی شخصیت تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی محبوب ترین ہستی کے لیے ہی یہ پوری کائنات تخلیق کی۔ یعنی کائنات کی تخلیق کا اولین مقصد حضورؐ کی ذات ہے۔ مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق تخلیق کائنات سے پہلے بھی حضورؐ کا نور موجود تھا اور اسی نور کی تکمیل کے لیے پوری کائنات تخلیق کی گئی ہے۔

غزل

غزل اردو کی مقبول ترین صنفِ شعر ہے۔ غزل کے لغوی معنی عورتوں یا عورتوں کے متعلق گفتگو کرنا ہے۔ ہرن کے منہ سے بوقتِ خوف جو دردناک چیخ نکلتی ہے، اسے بھی غزل کہتے ہیں۔ اس نسبت سے غزل وہ صنفِ شعر ہے جس میں حُسن و عشق کی مختلف کیفیات کا بیان ہو اور اس میں درد و سوز بہت نمایاں ہو۔ اصطلاحاً غزل کی مختلف تعریفیں کی گئی ہیں، جن کا مفہوم یہ ہے کہ غزل کے ہر شعر میں ایک مکمل مفہوم ادا ہوتا ہے۔ ہر شعر اپنا اپنا الگ مفہوم دیتا ہے۔

پوری غزل ایک بحر میں ہوتی ہے۔ غزل کا مطلع ہونا ضروری ہے۔ مطلع کے دونوں مصرعے ہم قافیہ و ہم ردیف ہوتے ہیں۔ پوری غزل ہم قافیہ و ہم ردیف (یا صرف ہم قافیہ) ہوتی ہے۔ باقی اشعار صرف دوسرے مصرعوں میں ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ بعض غزلیں مردّف (بغیر ردیف کے) بھی ہوتی ہیں۔ غزل کے آخری شعر (مقطع) میں شاعر بالعموم اپنا تخلص استعمال کرتا ہے۔ بعض غزلوں کے درمیانی شعروں میں بھی تخلص لایا جاتا ہے۔ غرض ایسے امور میں غزل گو کو کسی قدر آزادی ہوتی ہے۔

پرانے زمانے میں ایک غزل کے اشعار کی تعداد بالعموم پانچ سے سترہ تک ہوتی تھی لیکن طویل غزلوں کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ غزل گو شعراء نے ایک غزل کے بعد اسی بحر اور ردیف میں سہ غزلہ اور چہار غزلہ بھی لکھا ہے۔ انشا کے ہاں نو غزلہ بھی ملتا ہے، مگر جدید شعرا غزل میں تعدادِ اشعار کی قید کو ایک بے معنی چیز سمجھتے ہیں۔

عشق و عاشقی، غزل کا سب سے بڑا موضوع ہے اور عموماً غزل میں حسن و عشق کی مختلف کیفیات (مثلاً درد و غم، سوز و گداز، ہجر و وصال، محبوب کا ظلم و ستم، اس کی بے وفائی اور ناز و ادا وغیرہ کا بیان ہوتا ہے۔ تاہم غزل میں اتنی وسعت، رنگا رنگی اور تنوع ہے جتنی خود زندگی یا کائنات متنوع اور وسیع ہے۔ اس ہمہ گیری کے سبب غزل میں مذہبی، سیاسی، معاشرتی، تہذیبی، اخلاقی، فلسفیانہ، حکیمانہ اور عاشقانہ موضوعات و مسائل پر اظہارِ خیال کیا جاتا ہے۔ یوں معنی کے اعتبار سے غزل میں بڑی لچک ہے اور اس کی مقبولیت کا راز بھی یہی ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ غزل کا ہر شعر معنوی اعتبار سے ایک مکمل اکائی ہوتا ہے جبکہ دیگر تمام اصنافِ شعر میں بالعموم تسلسل خیال پایا جاتا ہے۔ البتہ کبھی کبھار پوری غزل میں یا اس کے چند شعروں میں موضوع یا خیال کا ربط و تسلسل موجود ہوتا ہے۔ اس کو قطعہ بند غزل کہتے ہیں۔ لیکن غزل کی انفرادیت بہر حال یہی ہے کہ اس کا ہر شعر اپنا جدا مفہوم رکھتا ہے۔

غزل کی زبان، دیگر اصناف شعر کے مقابلے میں بالعموم سادہ سلیس اور شستہ ہوتی ہے۔ تشبیہ و استعارہ اور صنائع بدائع کا موزوں متوازن اور مناسب استعمال غزل میں حسن و دلکشی پیدا کرتا ہے اور ان کا غزل متوازن اور بلا ضرورت استعمال غزل کو بوجھل بنا کر اس کے حسن اور وقار کو مجروح کرتا ہے۔ غزل گو کا لب و لہجہ دھیما اور نرم ہونا چاہیے۔

غزل کی صنف پہلے فارسی میں رائج ہوئی لیکن اس کا ماخذ عربی قصیدہ ہے۔ قصیدہ میں عشقیہ تشبیب کو غزل کہا جاتا تھا جس میں بالعموم محبوب کا سراپا بیان کیا جاتا اور اس کے حسن کی تعریف کی جاتی۔ ایرانی شعرا نے اس تشبیب کو قصیدے سے الگ کرکے ایک مستقل صنف ایجاد کی۔ نویں صدی عیسوی میں فارسی میں غزل گوئی کا آغاز ہوا۔ دسویں صدی کے نصف اول میں رودکی نے اس صنف کو فروغ دیا اور غزل کا دیوان مرتب کیا۔ رودکی کے بعد غزل مسلسل ترقی کرتی گئی اور اس کے موضوعات میں وسعت پیدا ہوئی۔ عشق مجازی کے ساتھ ساتھ تصوف اور اخلاق کے مضامین غزل میں داخل ہوئے۔

اردو میں غزل گوئی کی ابتدا امیر خسرو سے ہوئی لیکن دکنی شاعروں نے اس صنف کو پروان چڑھایا۔ قلی قطب شاہ کو اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔ دکنی شعرا نے غزل کا سانچا فارسی سے لیا لیکن فارسی کی پیروی بہت کم کی۔ لیکن ولی دکنی نے فارسی غزل کے مطالعے کے بعد اردو غزل میں فارسی علامات اور لفظیات کو پہلی مرتبہ شامل کیا اور آج کی موجودہ غزل کے روایتی پیمانوں کو ترتیب دینے میں انہوں نے اہم کردار ادا کیا۔ اس لیے ولی کو اردو شاعری کا باوا آدم کہا جاتا ہے۔

غزل کے ارتقاء میں میر، سودا، درد، انشاء، جرات، مصحفی، آتش، غالب، ذوق، مومن، ظفر، داغ، حالی وغیرہ کا قابلِ قدر حصہ ہے۔ انشاء، جرات، رنگین اور ناسخ، لکھنوی دبستانِ غزل کے نمائندے ہیں۔ جن کے ہاں حسن و عشق کا خارجی اور جسمانی پہلو غالب ہے۔ اسی لیے ان کے ہاں مبتذل، فحش اور بازاری انداز کے شعر بھی ملتے ہیں۔ اور مشکل پسندی اور ظاہری آرائش کا غلبہ ہے۔ اس کے برعکس میر، درد، ظفر، شیفتہ اور حالی وغیرہ دبستانِ دہلی کے نمایاں غزل گو ہیں۔ ان کے ہاں داخلی واردات و قلبی احساسات کو دھیمے اور پر سوز لہجے میں بیان کیا گیا ہے۔ غالب اپنے جدت پسند مزاج کے سبب پرانے راستوں پر چلنا پسند نہیں کرتے ان کا اندازِ بیان منفرد ہے۔

جدید غزل کے بانی حالی ہیں۔ انھوں نے مبالغے سے اجتناب کیا اور حقیقت نگاری پر زور دیا ہے۔ انہی کی کوششوں سے غزل میں بہ اعتبارِ معانی وسعت اور بہ اعتبار فن نکھار پیدا ہو۔ اقبال نے غزل کو نئے افق سے روشناس کرایا۔ بعض غزل گوؤں کے نام یہ ہیں۔ یگانہ، فانی، حسرت موہانی، اصغر گونڈوی، جگر مراد آبادی، ماہر القادری، حفیظ ہوشیار پوری، احسان دانش، فراق گورکھپوری، ادا جعفری، فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، شکیب جلال، احمد فراز، ناصر کاظمی، ظفر اقبال، منیر نیازی، پروین شاکر، خالد احمد، غلام محمد قاصر، جمال احسانی وغیرہ شامل ہیں۔

ولی دکنی

1668ء میں اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ اس کے بعد حصول علم کے لیے احمد آباد آگئے۔ جو اس زمانے میں علم و فن کا مرکز تھا۔ ولی نے گجرات، سورت اور دہلی کا سفر بھی کیا۔ اس کے متعلق اشارے ان کے کلام میں موجود ہیں۔

دہلی میں ولی کی سعد اللہ گلشن سے ملاقات ہوئی۔ تو وہ ان کا کلام دیکھ کر بہت متاثر ہوئے اور مشورہ دیا کہ ان تمام مضامین کو جو فارسی میں بیکار پڑے ہیں۔ ریختہ کی زبان میں کام میں لانا چاہیے قائم چاندپوری نے اپنے تذکرے نکاتِ سخن میں لکھا ہے کہ ولی نے سعد کے مشورے پر عمل کیا اور دوسری مرتبہ دہلی گئے تو ان کے کلام کی خوب قدر ہوئی اور یہاں تک شہرت ہوئی کی امراء کی محفلوں میں اور جلسوں اور کوچہ و بازار میں ولی کے اشعار لوگوں کی زبان پر تھے۔

ولی کی تاریخ وفات بھی بے حد متنازع ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کی تحقیق کے مطابق وہ 1730 کے بعد فوت ہوئے، تاہم زیادہ تر محققین کا خیال ہے کہ ولی 1708 کے لگ بھگ فوت ہوئے تھے۔

جمال دوست شاعر

ولی کی شاعری میں حسن و جمال کا موضوع بڑا اہم ہے۔ ولی سے پہلے کسی شاعر، حسن و جمال کا بھرپور اور کامیاب تصور نہیں دیا۔ حسن کے احساس سے روح کی بالیدگی اور من کا سرور حاصل کرتے ہیں۔

آج گل گشت چمن کا وقت ہے اے نو بہار
بادہ گل رنگ سوں ہر بام گل لبریز ہے

ولی حسن و جمال کے شعری تجربات بیان کرتے ہوئے کسی غم یا دکھ کا اظہار نہیں کرتے کیونکہ وہ جمال دوست ہیں اس لئے کائنات کی ہر شے میں جمال دیکھتے ہیں ان کی نظر زندگی اور کائنات کے تاریک پہلوؤں کو نہیں دیکھتی وہ صرف روشن پہلوؤں کا نظارہ کرتی ہے جہاں خوشی، امید اور مسرت کی سدا بہار چھاؤں ہے وہ حسن سے مایوس ہو کر آہیں بھی نہیں بھرتے اس لئے کہ وہ بامراد عاشق ہیں اور محبوب کے حسن کا دیدار انہیں حاصل ہے

نہ جاؤں صحن گلشن میں کہ خوش آتا نہیں مجھ کو
بغیر از ماہ رو ہرگز تماشا ماہتابی کا

ڈاکٹر سید عبداللہ کے خیال میں ولی کی شاعری عراقی طرز کے زیادہ قریب ہے اس "عراقی" طرز سے ان کی مراد یہ ہے کہ ولی کے ہاں معاملات عشق کے بیان کے بجائے احساسات حسن کا بیان زیادہ ہے

تیرا لب دیکھ حیواں یاد آوے
ترا مکھ دیکھ کنعاں یاد آوے
ترے مکھ کی چمن کو دیکھنے سوں
مجھے فردوسِ رضواں یاد آوے

ولی کی شاعری میں سراپا نگاری بدرجہ اتم موجود ہے۔ ولی نے اپنی شاعری میں جس محبوب کی تخلیق کی ہے وہ ان سے پہلے اور شائد بعد میں بھی اردو شاعری میں نہیں ملتا۔ انھوں نے واقعیت اور تخیل کی مدد سے اپنے محبوب کے حسن کی مدح سرائی اور قصیدہ خوانی کی ہے ان کے اشعار سے محبوب کی خوبصورت تصویریں بنتی ہیں۔

وہ نازنیں ادا میں اعجاز ہے سراپا
خوبی میں گل رخاں سوں ممتاز ہے سراپا

ولی کی شاعری پر ہندی تہذیب اور گیتوں کے اثرات کو بھی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ اسی روایت کے زیر اثر ان کے ہاں محبوب کے لیے تانیث کا صیغہ بھی استعمال ہوا ہے

مت غصے کے شعلے سوں جلتے کوں جلاتی جا
ٹک مہر کے پانی سے تو آگ بجھاتی جا

غزلیات بمع تشریح

مت غصے کے شعلے سوں جلتے کوں جلاتی جا

ٹک مہر کے پانی سوں تو آگ بجھاتی جا

اس شعر میں سیدھی سی نثریوں ہوگی کہ اے محبوب غصے کے شعلوں سے میرے دل کو نہ جلا بلکہ پیار و محبت کے ٹھنڈے پانی سے محبت کی اس آگ کو ٹھنڈا کر۔ محبوب اپنی مست اداؤں سے عاشق کے دل میں پہلے محبت کی آگ لگاتا ہے پھر اپنی بے پروائی اور ناراضگی سے اس آگ کو مزید بھڑکاتا ہے مگر اس آگ کو بجھانے کا علاج بھی اسی کے پاس ہے۔ مہر و محبت کی اداؤں سے جفاؤں کا ایک ساتھ ذکر اور آگ و پانی کی صفت تضاد نے شعر کے حسن میں اضافہ کیا ہے۔

تجھ چال کی قیمت سوں دل نیئں ہے مرا واقف

اے مان بھری چنچل ٹک بھاؤ بتاتی جا

محبوب کے اعضائے جسمانی کی تعریف ہر شاعر کا محبوب موضوع ہے مگر ولی کے ہاں حسن محبوب اور اس کے سراپا کی تعریف و توصیف بھی موجود ہے۔ اس شعر میں شاعر محبوب کی چال کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ تیری خوش خرامی بڑی خوب ہے اس میں تیری فطری شوخی کے ساتھ ساتھ غرور کا حسن بھی شامل ہے۔ اور اس حسین چال کی قیمت کا اندازہ تو ہی لگا سکتا ہے اس لیے خود ہی اس کی قیمت بتادے۔

اس رات اندھیاری میں مت بھول پڑوں تجھ سوں

ٹک پاؤں کے جھانجے کی جھنکار سناتی جا

ولی کی شاعری نشاطیہ رنگ لیے ہوئے ہے۔ وہ ہر جگہ مسرت اور نشاط کا پہلو نکال لیتے ہیں۔ اندھیری رات میں راستہ دکھائی دیتا ہے نہ کوئی راستہ بتانے والا نظر آتا ہے مگر ایسے میں عاشق کو ہر حال میں درِ محبوب تک پہنچنا ہے اس کے لیے وہ محبوب سے استدعا کر رہا ہے کہ راہ چلتے چلتے اپنی پازیب کی جھنکار سے اس کی رہنمائی کرتا رہے تاکہ وہ اس آواز کے ساتھ ساتھ راستہ طے کرتے ہوئے محبوب کے تعاقب میں اس کے گھر تک پہنچ جائے۔

مجھ دل کے کبوتر کوں پکڑا ہے تری لٹ نے

یہ کام دھرم کا ہے ٹک اس کوں چھڑاتی جا

ولی کہتا ہے کہ میرے دل کا کبوتر محبوب کی زلفوں کا شکاری ہو چکا ہے اور شاعر اب مذہب کی آڑ لے کر اس کو آزاد کروانا چاہتا ہے۔ دھرم کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ ولی کا محبوب ہندو ہے۔ شاعر یہاں محبوب سے خود کو آزاد کرنے کی درخواست کر رہا ہے۔ جو کہ خود عاشق کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ لیکن عاشق چونکہ مزید محبوب کے ظلم و ستم کو برداشت کرنے کا روادار نہیں اس لیے وہ یہ نیک کام محبوب کے ذریعے سے کروانے کا خواہش مند ہے۔

تجھ مکھ کی پرستش میں گئی عمر میری ساری

اے بت کی بجن ہاری ٹک اس کوں پجاتی جا

ولی ایک آزاد خیال انسان تھے۔ وہ اپنی محبت کا برملا اظہار کرتے ہیں۔ محبت میں مذہب اور ذات اور نسل کو رکاوٹ نہیں ہوتی۔ ان کا محبوب سے براہ راست خطاب کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے کئی ایک محبوب تھے جن کا مذہب ولی کے مذہب سے مختلف تھا۔ اس شعر میں ولی اپنی ہندو محبوبہ سے کہتا ہے تو بت کی پجارن ہے اور میں تیرے چہرے کا پجاری ہوں۔ تو ہمیشہ بت کی پوجا سامنے سے کرتی ہے اس لیے میری تمام عمر کی پرستش کے صلے میں تو میرے سامنے بیٹھ جا تاکہ میں سامنے سے تیری پوجا کر سکوں۔ شاعر دراصل اس شعر میں دیدار کا خواہاں ہے اور اس مقصد کے لیے محبوب کی مذہب کی آڑ لے کر اُس کو اپنی طرف بلانے کی سعی کر رہا ہے۔

تجھ گھر کی طرف سندر، آتا ہے ولی دائم

مشتاق درس کا ہے ٹک درس دکھاتی جا

والی اپنے روایتی طرز تخاطب سے محبوب کو مخاطب کر رہا ہے اور اسے سندر کے نام سے پکار رہا ہے کہ میرے پیارے محبوب میں بار بار تیرے در پر حاضر ہوتا ہوں اور دیدار کا طلب گار ہوتا ہوں مگر ہر بار ناکام و نامراد واپس آتا ہوں۔ اب کی بار صرف ایک بار مجھے دکھائی دے دے اور بس بقول میر:

بار بار اس کے در پہ جاتا ہوں

حالت اب اضطراب کی سی ہے

یاد کرنا ہر گھڑی اس یار کا

ہے وظیفہ مجھ دلِ بیمار کا

محبوب سے دوری کے باوجود عاشق ترک عشق پر کبھی آمادہ نہیں ہوتا بلکہ مایوسی اور تنہائی میں بھی محبوب کے ذکر سے دل کو تسکین پہنچتی ہے۔ وہ ہر وقت اس کے تصور میں کھویا رہتا ہے اور محبوب کے نام کی مالا جپتا ہے۔ ولی اپنے ہجر کے ستائے ہوئے اس بیمار دل کے بارے بھی کچھ ایسی ہی کیفیات کا ذکر کر رہے ہیں۔ یعنی اس کے مطابق محبوب کے نام کا ورد کرنا ہی عشق کے غموں کا علاج ہے۔

آرزوئے چشمۂ کوثر نہیں

تشنہ لب ہوں شربت دیدار کا

شاعر کے نزدیک محبوب حقیقی کے چاہنے والوں کے لیے جنت کا حصول ایک بے معنی عمل ہے۔ ان کے نزدیک ایسے عاشقوں کے لیے جنت کے حوضوں اور چشموں کے میٹھے شہد اور دودھ کی کوئی تمنا نہیں ہوتی اس لیے کہ یہ مشروب ان کے دیدار کی پیاس نہیں بجھا سکتے کیونکہ وہ تو صرف محبوب حقیقی کے دیدار کے پیاسے ہوتے ہیں۔ یعنی جنت کے حصول کا واحد مقصد صرف اور صرف محبوب حقیقی کا دیدار ہے۔ بقول اقبال:

یہ جنت مبارک رہے زاہدوں کو

کہ میں آپ کا سامنا چاہتا ہوں

عاقبت کیا ہووے گا معلوم نئیں

دل ہوا ہے مبتلا دلدار کا

میدان عشق میں قدم رکھنے والے انجام سے بے پرواہوتے ہیں۔ انجام سے بے نیازی ہی عشق کی پختگی کی علامت ہے۔ عشق کا آغاز بھی موت ہے اور انجام بھی موت۔ ولی اس شعر میں کہتے ہیں کہ انجام کی پرواکیے بغیر میں عشق کی آگ میں کود پڑا ہوں۔ کیوں کہ انجام کا سوچنا عقل کا کام ہے۔ عشق اور دل کا کام کر گزرنا ہے۔

گر ہوا ہے طالبِ آزادگی

بند مت ہو سبحہ و زنار کا

شعراء اور عشاق وسیع ذہن کے مالک لوگ ہوتے ہیں۔ ان کا مذہب انسانیت ہوتا ہے اور ان کی شاعری کا بنیادی پیغام ہی نسل انسانی سے محبت کرنا ہوتا ہے۔ اس شعر میں ولی دکنی نے اسی وسیع القلبی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ انسان کو مذہبی عقائد کو خود پر اتنا حاوی نہیں کر لینا چاہیے کہ وہ اس کا اسیر ہو کر رہ جائے اور اس کی بدولت وہ دوسرے انسانوں سے نفرت کرنا شروع کر دے۔

اے ولی ہونا سریجن پر نثار

مدعا ہے چشمِ گوہر بار کا

راہ عشق بڑی کھٹن اور دشوار ہوتی ہے اس راہ میں عاشق کو بڑی دقتوں دشواریوں اور مشکلوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے ان سے عہدہ بر آ ہونے کے لیے بڑے صبر واستقلال کی ضرورت ہوتی ہے۔شاعر کے نزدیک محبوب سے دوری ایک مشکل کٹھن مرحلہ ہوتا ہے لیکن فراق میں بہنے والے آنسوؤں کا مطلب یہ ہر گز نہیں کہ عاشق ان کٹھن اور مشکل حالات کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔بلکہ عاشق کے یہ آنسو صرف اور صرف محبوب کے حصول کے لیے ہونے والی دعاؤں کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

میر تقی میر

میر تقی میر، آگرہ میں 1723ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام محمد علی تھا لیکن علی متقی کے نام سے مشہور تھے۔ اور درویش گوشہ نشین تھے۔ میر نے ابتدائی تعلیم والد کے دوست سید امان اللہ سے حاصل کی مگر مزید تعلیم سے پہلے جب میر ابھی نو برس کے تھے وہ چل بسے تب ان کے بعد ان کے والد نے خود تعلیم و تربیت شروع کی۔ مگر چند ماہ بعد ہی ان کا بھی انتقال ہو گیا۔ یہاں سے میر کی زندگی میں رنج و الم کے طویل باب کی ابتداء ہوئی۔

ان کے سوتیلے بھائی محمد حسن نے اچھا سلوک نہ کیا۔ تلاش معاش کی فکر میں دہلی پہنچے اور ایک نواب کے ہاں ملازم ہو گئے۔ مگر جب نواب موصوف ایک جنگ میں مارے گئے تو میر آگرہ لوٹ آئے۔ لیکن گزر اوقات کی کوئی صورت نہ بن سکی۔ چنانچہ دوبارہ دہلی روانہ ہوئے اور اپنے خالو سراج الدین آرزو کے ہاں قیام پذیر ہوئے۔ سوتیلے بھائی کے اکسانے پر خان آرزو نے بھی پریشان کرنا شروع کر دیا۔ کچھ غم دوراں، کچھ غم جاناں سے جنوں کی کیفیت پیدا ہو گئی۔

میر کا زمانہ شورشوں اور فتنہ و فساد کا زمانہ تھا۔ ہر طرف تنگدستی و مشکلات برداشت کرنے کے بعد بالآخر میر گوشہ عافیت کی تلاش میں لکھنؤ روانہ ہو گئے۔ اور سفر کی صعوبتوں کے بعد لکھنؤ پہنچے۔ وہاں ان کی شاعری کی دھوم مچ گئی۔ نواب آصف الدولہ نے تین سو روپے ماہوار وظیفہ مقرر کر دیا۔ اور میر آرام سے زندگی بسر کرنے لگے۔ لیکن تند مزاجی کی وجہ سے کسی بات پر ناراض ہو کر دربار سے الگ ہو گئے۔ آخری تین سالوں میں جوان بیٹی اور بیوی کے انتقال نے صدمات میں اور اضافہ کر دیا۔ آخر اقلیم سخن کا یہ حرماں نصیب شہنشاہ 87 سال کی عمر پا کر 1810ء میں لکھنؤ کی آغوش میں ہمیشہ کے لیے سو گیا۔

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخ

آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں (غالب)

نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب

ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا (ذوق)

شعر میرے بھی ہیں پر درد، و لیکن حسرت

میر کا شیوہ گفتار کہاں سے لاؤں (حسرت)

اللہ کرے میر کا جنت میں مکاں ہو

مرحوم نے ہر بات ہماری ہی بیاں کی (ابنِ انشا)

میر کا تصور غم:

میر کا تصور غم تخیلی اور فکری ہے۔ یہ قنوطیت پیدا نہیں کرتا۔ اس کے ہوتے ہوئے میر کی شاعری میں توازن اور ٹھہراؤ نظر آتا ہے۔ شکستگی کا احساس نہیں ہوتا اور ضبط، سنجیدگی اور تحمل ملتا ہے۔ وہ غم سے سرشار ہو کر اسے سرور اور نشاط بنا دیتے ہیں۔ مجنوں گورکھپوری ان کے تصورات غم سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"میر نے غم عشق اور اس کے ساتھ غم زندگی کو ہمارے لیے راحت بنا دیا ہے۔ وہ درد کو ایک سرور اور الم کو ایک نشاط بنا دیتے ہیں۔ میر کے کلام کے مطالعہ سے ہمارے جذبات و خیالات اور ہمارے احساسات و نظریات میں وہ ضبط اور سنجیدگی پیدا ہوتی ہے۔ جس کو صحیح معنوں میں تحمل کہتے ہیں۔

مجھ کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب میں نے

درد و غم کتنے کئے جمع تو دیوان کیا

چشم رہتی ہے اب پر آب بہت
دل کو میرے ہے اضطراب بہت

میر کی دردمندی

میر کے ہاں دردمندی ان کے فلسفہ غم کا دوسرا نام ہے۔ اگرچہ لفظ فلسفہ انہوں نے استعمال ہی نہیں کیا، مگر اس سے مراد ان کی یہی ہے۔ دردمندی سے مراد زندگی کی تلخ حقیقتوں کا اعتراف وادراک اور مقدور بھر ان تلخیوں کو دور کرنے کی کوشش کا نام ہے۔ یہ دردمندی ان کی زندگی کے تضادات سے جنم لیتی ہیں۔ دردمندی کا سرچشمہ دل ہے۔ میر کے یہ اشعار ذہن میں رکھیے:

آبلے کی سی طرح ٹھیس لگی پھوٹ بہے
دردمندی میں کٹی ساری جوانی اپنی

دنیا کی بے ثباتی

بے ثباتی دنیا کا احساس اردو شاعری میں بہت عام ہے۔ اس موضوع پر تقریباً سبھی شعراء نے طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن دبستان دہلی کے شعراء کے ہاں بے ثباتی کا احساس زیادہ گہرا نظر آتا ہے۔ خصوصاً میر تقی میر کی تمام شاعری میں دنیا کی بے ثباتی کا ذکر بڑے واضح الفاظ میں ملتا ہے۔ جس کی اصل وجہ اُس دور کے غیر یقینی اور ہنگامی حالات تھے۔ جس کی وجہ سے اُن کی شاعری میں دنیا سے بے زاری اور بے ثباتی کے موضوعات پروان چڑھے۔

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات
کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

خطابیہ انداز

میر کو خطاب اور گفتگو کا انداز بڑا پسند ہے۔ کبھی وہ خود سے مخاطب ہو کر "باتیں" کرتے ہیں اور کبھی کسی دوسرے شخص سے۔ کبھی ان کا تخاطب بلبل سے ہے اور کبھی شمع و پروانہ سے۔ ان تمام حالتوں میں شعر میں بات چیت اور بے تکلفی کا رنگ بہر حال قائم رہتا ہے۔ ایک مانوس اور محبت بھری آواز کانوں سے ٹکراتی ہے جو اپنے پیرایہ ادا کی کشش سے قاری یا سامع کو فوراً اپنے حلقہ اثر میں لے لیتی ہے اور وہ خود بخود میر صاحب کی ان بے ساختہ اور پر خلوص "باتوں" سے لطف اندوز ہونے لگتا ہے۔

میں جو بولا کہا کہ یہ آواز
اُسی خانہ خراب کی سی ہے
بارے دنیا میں رہو غمزدہ یا شاد رہو
ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

تشبیہات و استعارات

میر نے اپنے شیوہ گفتار کو زیادہ موثر اور دلکش بنانے کے لئے تشبیہ و استعارے کا بڑے سلیقے سے استعمال کیا ہے۔ یہ تشبیہات مردہ نہیں بلکہ ان کے اندر زندگی دوڑتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس لیے کہ ان کے خالق کے خون میں گرمی اور حرارت ہے اور وہ پوری صداقت اور پورے فنی خلوص سے اپنی زندگی بھر کے تجربات و تاثرات کو ان تشبیہات و استعارات کی صورت میں پیش کر رہا ہے۔ ان میں کہیں بھی تصنع یا بناوٹ کا احساس تک نہیں ہوتا۔

شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے
دل ہوا ہے چراغ مفلس کا
نازکی اس کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے
میر ان نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

تصوف

میر کی شاعری کے فکری عناصر میں متصوفانہ رنگ خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ ان کے باپ اور چچا صوفیانہ مزاج کے مالک تھے اور رات دن جذب و مستی کی کیفیات میں سرشار رہتے تھے۔ میر نے ان بزرگوں کی آنکھیں دیکھی تھیں۔ وہ بھلا کس طرح صوفیانہ تجربہ سے الگ رہ سکتے تھے۔ ان کے ہاں تصوف کا تجربہ محض روایتی نہیں ہے یہ رسمی بھی نہیں ہے، اس تجربے نے میر کے ذہن و فکر کی تہذیب پر گہرے اثرات مرتسم کیے ہیں۔ وہ زندگی کو کسی عام انسان کی طرح نہیں دیکھتے، ان کی نظر صاف دل صوفی کی نظر ہے۔

موت اک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے

غزلیات بمع تشریح

جس سر کو غرور آج ہے یاں تاج وری کا
کل اس پہ یہیں شور ہے پھر نوحہ گری کا

اس شعر میں دنیا کی ناپائیداری اور بے ثباتی کے بارے میں بتایا گیا ہے۔ دراصل میر ایک ایسے دور سے تعلق رکھتے تھے جب مغلیہ سلطنت کا چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ حکومتوں کے تختے الٹ رہے تھے۔ میر نے یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ لہٰذا وہ فرماتے ہیں کہ جس سر کو بھی اس بات پر ناز ہے کہ اُس نے تاج پہن رکھا ہے۔ اُسے غرور و تکبر سے کام نہیں لینا چاہیے۔ کیونکہ وہ وقت بھی بہت جلد آنے والا ہے جب وہ اس دنیا سے کوچ کر جائے گا تب اس کی میت لوگوں کے سامنے رکھی ہوگی جس پر اس کے عزیز و اقارب ماتم و فریاد کریں گے لیکن وہ کچھ بھی نہیں کر سکے گا۔ میر کے نزدیک دنیاوی اقتدار، دولت، بڑائی یہ سب فانی اور چند روزہ ہیں۔

کل پاؤں ایک کاسہ سر پہ جو آگیا ۔۔۔ یکسر وا ستخواں شکستوں سے چور تھا
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر ۔۔۔ میں بھی کبھو کسو کا سر پر غرور تھا

آفاق کی منزل سے گیا کون سلامت
اسباب لُٹا راہ میں یاں ہر سفری کا

میر صاحب فرماتے ہیں کہ کائنات انسان کے لیے ایک مسافر خانہ ہے جہاں پر انسان مسافر بن کر آتا ہے اور پھر یہاں کچھ محدود عرصہ گزارنے کے بعد وہ اگلے جہاں کو کوچ کر جاتا ہے۔ کبھی بھی انسان کو یہاں مستقل قیام نہیں۔ میر کے نزدیک دنیا کے اس مسافر خانے سے کوئی بھی انسان خیریت سے نہیں گزرا ۔ یہاں ہر مسافر اپنا سامان لٹا کر چلا جاتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ انسان دنیا میں اپنے اگلے سفر یعنی عاقبت سے بے پرواہ ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ موت کا فرشتہ آجاتا ہے اور تب اس کے پاس کوئی زادِ راہ نہیں ہوتا۔

جائے جب یہاں سے کچھ بھی نہ پاس ہو گا
دو گز کفن کا ٹکڑا تیرا لباس ہو گا

زنداں بھی شورش نہ گئی اپنے جنوں کی
اَب سنگ مداوا ہے اس آشُفتہ سری کا

عاشقوں کے لیے جنونی کیفیت بڑی لذت انگیز ہوتی ہے۔ مگر لذت کے ساتھ ساتھ اس کیفیت میں انہیں تکلیفات کا بھی سامنا کرنا ہوتا ہے۔ جنون کی کیفیت میں انہیں پتھر بھی مارے جاتے ہیں۔ یہاں پر بھی عاشق حالتِ جنون میں ہے۔ جب اس کا پاگل پن انتہا کو پہنچ جاتا ہے تو لوگ اسے پتھروں سے مارتے ہیں۔ جس سے وہ زخمی ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں عاشق کے کچھ دوست اور ہمدرد لوگ اسے قید خانے میں ڈال دیتے ہیں۔ تاکہ وہ لوگوں کے پتھروں سے بھی محفوظ رہ سکے اور اس کے جنون میں کمی آئے۔ لیکن عاشق کی کیفیت وہاں پر مزید خراب ہو جاتی ہے اور اس میں جنون مزید بڑھ جاتا ہے۔ میر فرماتے ہیں کہ میرے پاگل پن کی وجہ سے یار لوگوں نے ازراہِ ہمدردی قید خانے میں ڈال دیا ہے۔ لیکن وہاں بھی میری ہنگامہ آرائی میں کوئی کمی نہیں آئی۔ لہٰذا میرے پاگل پن کا اگر کوئی علاج ہے تو وہ یہ ہے کوئی ایک بڑا پتھر لے کر میرے سر پر دے مارے تاکہ میرے ساتھ میری دیوانگی بھی ختم ہو جائے۔

ہر زخمِ جگر داورِ محشر سے ہمارا

انصاف طلب ہے تیری بیداد گری کا

یہ بات اسلامی عقیدے میں شامل ہے کہ روزِ محشر انسان کے اعضاء خود ہر بات کی گواہی دیں گے۔ میر صاحب نے اس بات کو سامنے رکھتے ہوئے اس شعر میں فرمایاہے کہ محبوب نے جو ظلم و ستم ڈھائے ہیں اُن کا ازالہ دنیا میں نہیں ہو سکتا۔ لیکن قیامت کے دن میرا ایک ایک زخم چیخ چیخ کر اللہ تعالیٰ سے محبوب کے مظالم پر انصاف مانگے گا اور مجھے یقین ہے کہ وہاں پر مجھے انصاف مل جائے گا۔

اپنی تو جہاں آنکھ لڑی، پھر وہیں دیکھو

آئینے کو لپکا ہے پریشاں نظری کا

آئینے کی صفت ہے کہ جو بھی اس میں اپنا چہرہ دیکھاہے اسے پنا چہرہ حسین نظر آتا ہے آئینہ کچھ لمحے تو اُس کے گُن گالیتاہے پھر جب وہ نظروں سے اوجھل ہوتاہے تو آئینہ کسی اور کو آنکھوں میں بسالیتاہے۔ میر صاحب فرماتے ہیں ہم آئینے کی طرح بے وفا نہیں کہ جس کے سامنے جاتاہے اسی کے گن گاتاہے۔ میر کے نزدیک ایک سچے عاشق کے لیے محبوب کے علاوہ کسی سے دل لگانا کفر کے مترادف ہوتاہے۔

ٹک میرؔ جگر سوختہ کی جلد خبر لے

کیا یار بھروسہ ہے چراغ سحری کا

میر نے اپنے جلے ہوئے جگر کو صبح کے چراغ سے تشبیہ دی ہے۔ جس میں تیل ختم ہو جاتاہے اور بجھنے کے قریب ہوتاہے۔ میر اپنے محبوب سے مخاطب ہو کر یہ التجا کرتے ہیں تمہاری بے وفائی کی وجہ سے میر کا جگر جل جل کر چراغ سحر کی صورت اختیار کر چکاہے جو کسی بھی وقت بجھ سکتاہے اور میری موت واقع ہو سکتی ہے۔ اس لیے اے میرے محبوب تم اپنے نظر کرم سے اس بجھتے چراغ کو روشن رکھ سکتاہے اور ایسا اس وقت ممکن ہے جب تو میر کو اپنی توجہ کا مرکز بنا لے۔

ہے گی طلبِ شرطیاں کچھ تو کیا چاہیے

بیٹھے نہیں بنتی میاں، کچھ تو کیا چاہیے

شاعر کہتاہے کہ ہر آرزو اور خواہش کو پورا کرنے کے لیے بہت ضروری ہے کہ کچھ نہ کچھ کام کیا جائے۔ میاں آرام سے بیٹھے رہنے سے بات نہیں بنتی۔ قرآن حکیم میں ارشادِ ربانی ہے۔ ترجمہ: انسان کو وہی کچھ ملتاہے جس کے لیے وہ کوشش کرے) مشہور ضرب المثل ہے۔ حرکت میں برکت ہے۔ مولانا حالی بھی فرما گئے ہیں:

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی

نہ جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

عشق میں اے ہمرہاں کچھ تو کیا چاہیے

گریہ و شور و فغاں، کچھ تو کیا چاہیے

شاعر کہتا ہے کہ اگر عشق کیا ہے تو اس کا کسی نہ کسی طرح اظہار کرنا بھی ضروری ہے۔ کیونکہ اگر عاشق دل ہی دل میں عشق کی آگ میں سلگتا رہے اور اس قدر رازداری سے کام لے اور بدنامی سے ڈرے کہ محبوب سے دل کی بات تک نہ کہے تو محبوب کیسے مائل بہ کرم ہو گا۔ ضروری ہے کہ عاشق خوب زور زور سے روئے، شور و غل مچائے اور بلند آواز میں فریاد کرے تاکہ محبوب کو پتہ چل جائے اور لوگوں سے بھی یہ بات ڈھکی چھپی نہ رہے۔ بہت ممکن ہے اس دیوانگی کی سی کیفیت پر محبوب کو ترس آجائے اور وہ محبت کا جواب محبت سے دینے لگے۔ یہ بھی ممکن ہے کچھ لوگ محبوب کو سمجھائیں اور عاشق کے لیے راہ ہموار کریں۔ اور محبت کامیاب ہو جائے۔ غرض کچھ نہ کچھ ضرور کرنا چاہیے۔ ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر کچھ حاصل نہ ہو گا۔

ہاتھ رکھے ہاتھ پر، بیٹھے ہو کیا بے خبر

چلنے کو ہے کارواں، کچھ تو کیا چاہیے

شاعر کہتا ہے کہ اے غافل انسان! تو ہاتھ پہ ہاتھ رکھے بیٹھا ہے۔ قافلہ منزل کی طرف روانہ ہونے والا ہے۔ مایوس اور ناامید ہو کر بیٹھ رہنے سے کبھی کوئی منزل پر نہیں پہنچا۔ تجھے بھی کچھ نہ کچھ تگ و دو کرنی چاہیے۔ ظاہر ہے جو لوگ محنت و مشقت کرتے ہیں، زندگی کی دوڑ میں بہت آگے نکل جاتے ہیں اور نہایت کامیاب زندگی گزارتے ہیں اور جو لوگ سستی اور کاہلی کا مظاہرہ کرتے ہیں کسی منزل پر نہیں پہنچ پاتے

میں جو کہا تنگ ہوں، مار مروں کیا کروں

وہ بھی لگا کہنے ہاں، کچھ تو کیا چاہیے

شاعر کہتا ہے کہ جب میں نے یہ کہا کہ میں حالات سے تنگ ہوں۔ میں یا تو کسی کو مار ڈالوں یا اپنے آپ کو ہلاک کر لوں۔ میری یہ بات سن کر اس نے کہا کہ ہاں، ٹھیک ہے۔ کچھ نہ کچھ تو ضرور کرنا چاہیے۔ عاشق کے یہ کہنے پر کہ وہ زندگی سے بیزار ہو چکا ہے۔ دوست یا محبوب کو حوصلہ دینا چاہیے تھا لیکن وہ کہتا ہے کہ کچھ کر گزرنا چاہیے، فارغ بیٹھنے سے تو یہ بہت اچھا ہے کہ خود کو مار ڈالو مجھے اس کی کوئی پروا نہیں۔

یہ تو نہیں دوستی، ہم سے جو تم کو رہی

پاسِ دلِ دوستاں، کچھ تو کیا چاہیے

محبوب سے مخاطب ہو کر شاعر کہتا ہے کہ اے محبوب ہمارے ساتھ جو سلوک تم کر رہے ہو یہ تو دوستی نہیں ہے۔ دوستوں کا دل رکھنے کے لیے بھی کچھ نہ کچھ کرنا پڑتا ہے۔ تم ہر وقت ہم پر ظلم و ستم ڈھاتے رہتے ہو۔ کیا یہ تمہاری دوستی ہے۔ دوست دوستو کے لیے بہت کچھ کرتے ہیں۔ تم کیسے دوست ہو، تمہیں اپنے دوست کی پریشانی کا کوئی خیال نہیں۔ حالانکہ داناؤں کا کہنا ہے کہ "دوست وہ ہے جو مصیبت میں کام آئے۔"

میر نہیں پیر تم، کاہلی اللہ رے

نام خدا ہو جواں، کچھ تو کیا چاہیے

میر صاحب خود سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ اے میر تم کوئی بوڑھے تو نہیں ہو گئے۔ خدا کے فضل و کرم سے جوان ہو۔ کاہلی اور سستی چھوڑو اور اللہ کا نام لے کر میدان میں نکلو۔ تمہیں کچھ نہ کچھ ضرور کرنا چاہیے۔ ظاہر ہے بوڑھے لوگوں میں کام کرنے کی صلاحیت نہیں رہتی۔ یہی وجہ ہے کہ بوڑھے اکثر سست اور کاہل ہوتے ہیں۔ لیکن نوجوان کی رگوں میں گرم خون گردش کر رہا ہوتا ہے اس لیے وہ آرام سے بیٹھ نہیں سکتے۔ اور انہیں آرام سے بیٹھنا بھی نہیں چاہیے

مرزا اسد اللہ خان غالبؔ

مرزا غالب کا نام اسد اللہ بیگ خاں تھا۔ باپ کا نام عبد اللہ بیگ تھا۔ آپ دسمبر 1797ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے۔ غالب بچپن ہی میں یتیم ہو گئے تھے ان کی پرورش ان کے چچا مرزا نصر اللہ بیگ نے کی لیکن آٹھ سال کی عمر میں ان کے چچا بھی فوت ہو گئے۔ نواب احمد بخش خاں نے مرزا کے خاندان کا انگریزوں سے وظیفہ مقرر کرادیا۔ 1810ء میں تیرہ سال کی عمر میں ان کی شادی نواب احمد بخش کے چھوٹے بھائی مرزا الٰہی بخش خاں معروف کی بیٹی امراء بیگم سے ہو گئی شادی کے بعد انہوں نے اپنے آبائی وطن کو خیر باد کہہ کر دہلی میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔

شادی کے بعد مرزا کے اخراجات بڑھ گئے اور مقروض ہو گئے۔ اس دوران میں انہیں مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور قرض کا بوجھ مزید بڑھنے لگا۔ آخر مالی پریشانیوں سے مجبور ہو کر غالب نے قلعہ کی ملازمت اختیار کر لی اور 1850ء میں بہادر شاہ ظفر نے مرزا غالب کو نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ کا خطاب عطا فرمایا اور خاندان تیموری کی تاریخ لکھنے پر مامور کر دیا اور 50 روپے ماہوار مرزا کا وظیفہ مقرر ہوا۔

غدر کے بعد مرزا کی سرکاری پنشن بھی بند ہو گئی۔ چنانچہ انقلاب 1857ء کے بعد مرزا نے نواب یوسف علی خاں والی رامپور کو امداد کے لیے لکھا انہوں نے سو روپے ماہوار وظیفہ مقرر کر دیا جو مرزا کو تادم حیات ملتا رہا۔ کثرت شراب نوشی کی بدولت ان کی صحت بالکل تباہ ہو گئی مرنے سے پہلے بے ہوشی طاری رہی اور اسی حالت میں 15 فروری 1869ء کو انتقال فرمایا۔

غالب کی شاعری کا جائزہ

غالب اردو شاعری میں ایک منفرد انداز کے مالک فن کار ہیں۔ وہ ایک عام فہم بات کو نئے ڈھنگ سے بیان کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ بقول مولانا حالی ان کی طبیعت عام روش پر چلنا گوارا نہیں کرتی تھی۔ چنانچہ انہوں نے بات کہنے کے کئی ایسے طریقے ایجاد کیے جن تک اور کسی ذہن کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ اپنے اندازِ بیان کے بارے میں خود غالب کا دعویٰ ہے:

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے

کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

فلسفیانہ شاعری

غالب وہ پہلے شاعر ہیں جنہوں نے اردو میں فلسفے کو رواج دیا۔ جدید عقلی علوم کے زیر اثر ان کی شاعری میں جابجا سوالات کی بھرمار دکھائی دیتی ہے۔ حالانکہ وہ ایک مکمل فلسفی کی طرح ان سوالات کے جوابات تلاش کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ ان کے دیوان کا پہلا شعر ہی سوال پر مشتمل ہے:

نقش فریادی ہے کس کی شوخیء تحریر کا

کاغذی ہے پیراہن ہر پیکر تصویر کا

تشکیک

فلسفے اور عقلی علوم سے دلچسپی کی وجہ سے غالب کے ہاں مذہبی عقائد کے سلسلے میں تشکیک کا پہلو نمایاں نظر آتا ہے۔ غالب کے زمانے میں جدید مغربی علوم نے یہاں کے روایتی تعلیم نظام کے مقابلے میں عقلیت پرستی کو رجحان دیا جس کی وجہ سے مذہب اور روحانی اقدار پر لوگوں کا اعتبار آہستہ آہستہ ختم ہونے لگا۔

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن

دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق

آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

فلسفہ غم:

غالب کے ہاں زندگی کا حقیقت پسندانہ شعور موجود ہے۔ وہ غم کو زندگی کا لازمی عنصر سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں جب تک انسان زندہ ہے اسے ان غموں کا مردانہ وار مقابلہ کرنا چاہیے:

غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج

شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

شوخی و ظرافت:

شوخی و ظرافت مرزا کی طبعیت کا خاصا تھا۔ وہ غم غلط کرنے کے لیے ظرافت کا سہارا لیتے تھے۔ چونکہ ان کی زیادہ تر زندگی تنگدستی اور مشکلات میں گزری تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں شوخی و ظرافت کا رنگ نمایاں ہے۔ مولانا حالی نے غالب کو حیوانِ ظریف قرار دیا ہے:

میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہیے غیر سے تہی

سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

لے تو لوں سوتے میں اس کے پاؤں کا بوسہ مگر

ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہو جائے گا

رمزیہ انداز

غالب کی شاعری کی ایک نمایاں خصوصیت رمزیہ انداز ہے۔ رمز اس کنایہ کو کہتے ہیں جس میں حقیقی معنوں تک پہنچنے کے لیے کچھ واسطوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان کی ابتدائی شاعری میں فارسیت اور رمز و ایما کے اثرات کی بنیادی وجہ عبد القادر بیدل کی پیروی کرنا ہے:

میں نے مجنوں پر لڑکپن میں اسد

سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا

اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

شاعر کہتا ہے کہ کہ ہماری قسمت میں محبوب سے ملنا نہیں لکھا تھا۔ ہم انتظار کرتے رہے کہ شاید محبوب میری طرف مائل بہ کرم ہو گا لیکن وہ ہم پر مہربان نہ ہوا۔ ہم مر گئے تو اچھا ہی ہوا۔ کم از کم محبوب کی ملاقات کے انتظار کی زحمت سے تو جان چھوٹ گئی۔ انتظار کی پریشانی مرگ مسلسل کی کیفیت تھی۔ وہ تو ختم ہو گی۔

ترے وعدے پہ جیے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا

کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

محبوب سے مخاطب ہو کر شاعر کہتا ہے کہ اے جان! اگر تیرا خیال ہے ہم تمہارے وعدے پر زندہ رہے۔ تو یہ تمہاری خوش فہمی ہے۔ اگر ہم تیرے وعدے کو سچا سمجھتے تو ہم خوشی سے مر گئے ہوتے۔ کیونکہ محبوب کے ملنے کا صرف وعدہ کرنا ہی عاشق کے لیے خوشی سے مر جانے کا مقام ہوتا ہے لیکن ہمارا زندہ رہنا اس بات کی دلیل ہے کہ تیرے وعدے کو ہم نے جھوٹا سمجھا کیونکہ تو نے کبھی کوئی وعدہ پورا نہیں کیا۔ تو ہمیشہ ہمیں ٹرخاتا رہا ہے۔

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیر نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

تیر نیم کش، وہ تیر جو چلاتے وقت کمان کو پوری طرح سے نہ کھینچا گیا ہو۔ محبوب سے مخاطب ہو کر شاعر کہتا ہے کہ اے محبوب! کوئی میرے دل سے پوچھے کہ تیری نظروں کے تیر نیم کش سے مجھے کس قدر لذت حاصل ہوئی۔ اگر تو نے پوری طرح سے چلہ کھینچ کر تیر چلایا ہوتا تو وہ جگر کے پار ہو جاتا اس طرح تیر جگر میں رہ جانے سے جو چھبن کا لگاتار احساس ہو رہا ہے اور اس چبھن سے جو لذت مجھے حاصل ہو رہی ہے یہ مجھے کہاں نصیب ہوتی۔ اس کی قدر و قیمت میرا دل ہی جانتا ہے۔ اگر محبوب نظروں سے نظر ملا کر دیکھتا تو نظروں کے تیر جگر کو چیرتے ہوئے نکل جاتے۔ محبوب کی جھکی جھکی نظروں سے دیکھنے کے انداز سے نظروں کے تیر جگر میں پیوست ہو کر رہ گئے ہیں۔ جھکی جھکی نظروں سے دیکھنے کے ہزار معنی اور ہزار لذتیں ہیں۔

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا

شاعر کے نزدیک دوست احباب اس نکتے کو نہیں جانتے کہ عاشق کے لیے ترکِ عشق کرنا ناممکن ہے۔ دوستی کا تقاضا تو یہ تھا کہ وہ محبوب سے ملانے کی کوئی تدبیر اختیار کرتے۔ کیونکہ اس مرض کا واحد علاج یہی تھا۔ اور اگر یہ ان کے بس کا روگ نہ تھا تو کم از کم مجھ سے ہمدردی ظاہر کرتے اور دلاسا دیتے۔ یہ کیسی دوستی ہے کہ بس ترک عشق کی نصیحت کرتے چلے جاتے ہیں اور عملی طور پر میری بھلائی کے لیے کوئی قدم نہیں اٹھاتے۔

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے شب غم بری بلا ہے
مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

میں کس سے کہوں کہ جدائی کی رات بہت بڑی مصیبت ہے۔ یہ بہت بڑے غم کی رات ہے۔ ظاہر ہے اگر محبوب پاس ہو تو ایک ایک لمحہ خوشیوں کے سانچے میں ڈھلا ہوتا ہے۔ مگر کسی سے کہنے کا کیا فائدہ۔ کوئی اس کا کیا علاج کر سکتا ہے۔ اس غم کو خوشی میں صرف محبوب ہی بدل سکتا ہے۔ اس غم کی رات سے تو مر جانا کہیں آسان تھا۔ محبوب سے جدائی کی رات میں نہ مرتے ہیں اور نہ جیتے ہیں۔ بس سسکتے رہتے ہیں۔ مرگ مسلسل کی سی کیفیت ہے۔ اگر ایک ہی دفعہ مر جاتے تو اچھا ہوتا۔

ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

شاعر کہتا ہے کہ محبوب کی جدائی کے غم سے بچنے کے لیے ہم نے موت کو گلے لگایا۔ مگر ہماری بڑی تذلیل اور رسوائی ہوئی۔ لوگ باتیں کرتے ہیں کہ غم کا بوجھ نہیں اٹھا سکا۔ بڑا کم حوصلہ تھا۔ لوگ میرے بارے میں طرح طرح کی باتیں کرتے ہیں۔ اس رسوائی کی موت سے تو اچھا تھا کہ ہم دریا میں ڈوب مرے ہوتے۔ نہ کہیں قبر ہوتی نہ اور کفن پہنانے کی نوبت آتی۔ اس شعر میں دوسرے معنی کچھ اس طرح نکلتے ہیں کہ عاشق کے مرنے کے بعد اس کی قبر خود محبوب کے لیے باعث ننگ ہوتی ہے اور عاشق کے مرنے پر جو لوگ طرح طرح کی باتیں بناتے ہیں وہ محبوب کی بدنامی کا سبب ہوتا ہے۔ شاعر کے نزدیک دریا میں ڈوب مرنے سے شاید میرا محبوب میری وجہ سے اس بدنامی سے محفوظ رہتا۔

یہ مسائل تصوف، یہ ترا بیان غالب

تجھے ہم ولی سمجھتے، جو نہ بادہ خوار ہوتا

خود سے مخاطب ہو کر غالب کہتے ہیں کہ اے غالب! ایک تو تصوف کی باتیں بہت راز داری کی ہوتی ہیں اور پھر تیرا بیان کرنے کا انداز اتنالا جواب ہے کہ اس نے انہیں چار چاند لگا دیئے ہیں۔ اگر تو شراب پینے کا عادی نہ ہوتا تو ہم واقعی تمہیں ولی اللہ سمجھتے۔ تیری میخواری نے تجھے ولایت کے مقام پر نہیں پہنچنے دیا۔

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے

جوشِ قدح سے بزمِ چراغاں کیے ہوئے

شاعر کہتا ہے کہ عرصہ دراز سے محبوب کی مہمان نوازی کا موقع نہیں ملا۔ جب محبوب ہمارا مہمان ہوتا تھا تو ہم گھر میں چراغاں بھی کرتے تھے یعنی بہت سے چراغ جلاتے تھے۔ اور خوب دادِ عیش دیتے تھے۔ ایک مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ساغر، ساغر سے ٹکراتے تھے۔ سرخ رنگ کی شراب سے بھرے ہوئے پیالے یوں لگتے تھے جیسے کئی چراغ ایک ساتھ جل رہے ہوں اور محفل میں روشنی پھیلا رہے ہوں۔

دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے

پندار کا صنم کدہ ویراں کیے ہوئے

شاعر کا دل ایک بگڑے ہوئے بچے کی طرح پھر اس گلی کے چکر لگانا چاہتا ہے جہاں گھومنا پھرنا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ غرور اور نخوت کے بت خانے کو ویران کر کے لوگوں کی لعنت و ملامت کا نشانہ بننا چاہتا ہے۔ انسانی دل کی نفسیات بھی بڑی عجیب ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ایک کام اچھا نہیں، لوگ برا بھلا کہیں گے، وہ اس غلط روش سے باز نہیں آتا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ جس کام سے انسان کو منع کیا جائے وہی کام کرتا اور ملامت اور شرمندگی کا سامنا کرنے کی پرواہ نہیں کرتا۔

پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں

سر زیر بارِ منتِ درباں کیے ہوئے

شاعر کہتا ہے کہ پھر میرا جی چاہتا ہے کہ دربان کی منت سماجت کر کے محبوب کے دروازے پر پڑا رہوں۔ عاشق جو کہ محبوب سے ملنے کے لیے بے چین رہتا ہے۔ اس کے سوائی اس کے پاس کوئی چارہ نہیں ہوتا کہ وہ دربان کی چاپلوسی کر کے دروازے پر پڑا رہے اور محبوب کو آتے جاتے دیکھتا رہے۔ ویسے بھی دربان عام طور پر اس معاملے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن

بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے

شاعر کہتا ہے کہ پھر جی چاہتا ہے کہ دن رات فرصت ہو، کوئی کام نہ کروں اور محبوب کی سوچوں میں کھویا رہوں۔ دراصل غم روزگار اور دنیاوی ذمہ داریاں انسان کو اتنا الجھا کر رکھ دیتی ہیں کہ اس کے پاس محبوب کو یاد کرنے کا وقت بھی نہیں رہتا۔ شاعر اپنی اسی لا ابالی زندگی کی طرف لوٹنے کی آرزو کر رہا ہے جس میں سوائے محبوب کے اس کے ذہن پر کوئی دوسرا تصور مرتسم نہیں ہوتا تھا۔

غالبؔ ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے

بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کیے ہوئے

اے غالب! ہمیں تنگ نہ کر، ہمیں نہ ستا کیونکہ ہماری آنکھوں سے آنسو اُمڈ آئیں گے۔ پھر آنسو تھم نہیں سکیں گے اور ہم نے پکا ارادہ کر لیا ہے ہمارے یہ آنسو ایک طوفان برپا کر دیں گے۔ وہ آنسوؤں کا سیلاب کسی طرح طوفانِ نوح سے کم نہیں وہ ساری دنیا کو لے ڈوبیں گے۔ شاعر یہ کہنا چاہتا ہے کہ وہ محبت میں ناکامی کی وجہ سے بہت دکھی ہے، آنسو تو پھوٹ نکلنے کا بہانہ چاہتے ہیں۔

علامہ اقبال

9 نومبر 1877ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام نور محمد اور والدہ کا نام امام بی بی تھا۔ ابتدائی تعلیم سکاچ مشن ہائی سکول سے حاصل کی۔ ایف اے کا امتحان مرے کالج سیالکوٹ سے پاس کیا۔ پھر بی اے اور ایم۔ اے (فلسفہ) گورنمنٹ کالج لاہور سے کیے۔ 1905ء میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے انگلستان چلے گئے۔ یورپ کے تین سالہ قیام کے دوران ٹرینی کالج (کیمبرج یونیورسٹی) سے بار۔ ایٹ۔ لا اور جرمنی کی میونخ یونیورسٹی سے فلسفہ میں پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔

اساتذہ میں مولوی میر حسن، داغ اور پروفیسر آرنلڈ کے نام زیادہ نمایاں ہیں۔ 21 اپریل 1938ء کو لاہور میں وفات پائی۔ ان کا مزار بادشاہی مسجد لاہور کے پہلو میں ہے۔ بانگ درا، بالِ جبریل، ضربِ کلیم، اسرار و رموز، پیامِ مشرق، جاوید نامہ، ارمغانِ حجاز، زبورِ عجم، پس چہ باید کرد اے اقوام شرق مع مسافران کی اردو اور فارسی شاعری کے مجموعے ہیں:

اقبال کی شاعری کا جائزہ

فلسفہ خودی

علامہ اقبال کے تمام افکار کا مرکز خودی ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں۔ جس طرح نظام شمسی میں سورج کی مرکزی حیثیت ہے اور دیگر سیارے متعینہ مدار پر سورج کے گرد رقص کناں ہیں۔ کچھ یہی عالم اقبال کے فلسفیانہ نظام کا ہے۔ جس میں خودی کو شمسی حیثیت حاصل ہے۔ اور بقیہ تصورات جیسے، اسلام، عشق، مرد مومن وغیرہ سبھی اس کے تابع ہیں۔ چونکہ ان کا سب سے اہم تصور خودی ہے۔ اس لیے انہوں نے اپنی شاعری کا سارا زور تعمیرِ خودی پر صرف کر دیا ہے۔ ان کے ہاں خودی سے مراد خودداری اور خودشناسی ہے۔ اس کا استحکام اطاعت، ضبطِ نفس اور نیابت الہیٰ سے ہوتا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ فرد کی صلاحیتوں کو پوری طرح اجاگر ہونے کا موقع ملنا چاہیے۔ اس کے ساتھ ہی "بے خودی" کا تصور بھی پیش کیا کہ فرد معاشرے کی بہبود کے لیے کام کرے۔

جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی
کھلتے غلاموں پر آدابِ شہنشاہی

تصور مرد مومن

خودی کے بعد اقبال کے یہاں سب سے زیادہ اہم مردِ مومن کا تصور ہے۔ اقبال کا مرد مومن خودی کا حامل بے پناہ قوت رکھنے والا انسان ہے۔ وہ طاقتور کو کمزور پر ظلم کرنے سے روکتا ہے۔ وہ زمین پر خدا کی نیابت کے فرائض انجام دیتا ہے۔ اقبال کا مرد مومن انہی صفات کا حامل ہے جو قرآن حکیم نے بیان کی ہیں۔

ہاتھ ہے اللہ کا بندہ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں کار کشا کار ساز

عشق اور عقل

یہ اقبال کا محبوب موضوع ہے۔ اگرچہ وہ عقل کی خوبیوں کا اعتراف کرتے ہیں لیکن عقل کے مقابلے میں عشق کو فوقیت دیتے ہیں۔ کیونکہ علامہ کے ہاں "عشق" کچھ کر گزرنے کا نام ہے۔ انقلاب بھی صرف عشق ہی لا سکتا ہے۔

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق

عقل ہے محو تماشائے لبِ بام ابھی

تصورِ ملت

علامہ اقبال کی خواہش تھی کہ ساری دنیا کے مسلمان رنگ، نسل، زبان اور جغرافیائی حد بندیوں کو نظر انداز کر کے ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوں۔ اور مل کر اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لیے کام کریں۔ چنانچہ اس جذبے کا اظہار علامہ کی شاعری کا ایک بڑا اہم موضوع ہے۔ شعر ملاحظہ ہو؛

ایک ہو مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے

نیل کے ساحل سے کر تابخاک کاشغر

فنی خوبصورتی

اقبال کی شاعری میں خوبصورت تشبیہات و استعارات کے ساتھ ساتھ صناع بدائع کا بہترین استعمال بھی ملتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ بہترین شاعرانہ مصوری، تغزل اور موسیقیت ان کی شاعری کے اعلیٰ ترین اوصاف ہیں:

جو میں سر بسجدہ ہوا کبھی تو زمیں سے آنے لگی صدا

تیرا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

علامہ اقبال کی شاعری فن اور فکر کا حسین امتزاج ہے۔ انہوں نے تازہ موضوعات کے ذریعے سے اردو غزل کو حکیمانہ، اخلاقی، سیاسی اور فلسفیانہ مزاج سے آشنا کیا۔ ان کے بعد آنے والوں شعراء پر ان کے اثرات کو بخوبی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ غالب کے بعد اقبال اردو شاعری کا ایک ایسا روشن مینار ہے جس کی روشنی میں آنے والی نسلوں کو نئی راہیں سوجھیں۔

غزلیات بمع تشریح

تیرے عشق کی انتہا چاہتا ہوں

مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں

محبوب سے مخاطب ہو کر علامہ اقبال کہتے ہیں کہ اے میرے محبوب میرا جی چاہتا ہے کہ میں تجھے اس قدر ٹوٹ کر پیار کروں کہ اس کی آخری حدوں کو چھو لوں۔ یعنی جہاں پر عشق کی حد ختم ہوتی ہے۔ وہاں تک پہنچ جاؤں۔ حالانکہ علامہ کے ہاں عشق کی کوئی حد مقرر نہیں۔ ویسے بھی تو محبوب کی جدائی آگ میں جلنے کا نام ہے نہ کہ اس کے وصال سے بہرہ ور ہونا۔ اگر محبوب کا وصال میسر آجائے تو عشق کی آگ بجھنے لگتی ہے اور عشق کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اس چیز کا احساس ہوتے ہی علامہ کہتے ہیں کہ میں کس قدر سادہ ہوں کہ میں چاہتا ہوں کہ تیرے عشق کی انتہا ہو جائے۔ جبکہ عشق کی انتہا سے مراد یہاں موت بھی لی جاسکتی ہے۔ شاعر خود سے کہتا ہے کہ میں کتنا سادہ ہوں کہ خود اپنی موت کو دعوت دے رہا ہوں۔

ستم ہو کہ ہو وعدہ بے حجابی

کوئی بات صبر آزما چاہتا ہوں

اے محبوب، تم ظلم و ستم ڈھاؤ یا بے تکلف ملاقات کا وعدہ کرو۔ یہ دونوں ایسے حوالے ہیں جن کی وجہ سے میرا اور تمہارا تعلق استوار رہے گا۔ اور یہی دونوں حوالے میرے صبر کو آزماتے رہیں گے اور مجھے مایوسی سے بچالیں گے۔ جبکہ مکمل طور سے محبوب کی جانب سے نظر انداز کر دینا شاعر کو کسی صورت میں بھی قابلِ قبول نہیں۔

یہ جنت مبارک رہے زاہدوں کو

کہ میں آپ کا سامنا چاہتا ہوں

پرہیز گار لوگ اسی لیے اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں کہ آخرت میں انہیں جنت ملے گی جہاں دودھ، شہد، اور شراب کی نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ لیکن اولیاء کے نزدیک دینداری اور عبادت گزاری کا یہ کوئی بلند مقصد نہیں۔ علامہ اقبال اس لیے کہتے ہیں کہ یہ جنت تم پرہیز گاروں کو مبارک ہو۔ میری اگر جنت جانے میں کوئی دلچسپی ہے تو وہ صرف اور محبوب حقیقی کے دیدار کی وجہ سے ہیں۔ یہاں اقبال نے ظاہری طور پر عبادت گزروں لوگوں پر ایک طرح کا طنز کیا ہے جو کہ لالچ میں آ کر خدا کی عبادت کرتے ہیں۔

ذرا سا تو دل ہوں مگر شوخ اتنا

وہی "لن ترانی" سنا چاہتا ہوں

اس شعر میں تلمیح پائی جاتی ہے۔ موسیٰ علیہ السلام، اللہ تعالیٰ سے ہمکلام ہونے کے لیے طور پر جایا کرتے تھے اور بار بار کہتے تھے۔ اے میرے پروردگار مجھ کو دکھا کہ میں تجھے دیکھ سکوں) اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لن ترانی: تو مجھے ہرگز نہیں دیکھے گا) موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے زیادہ اصرار پر اللہ تعالیٰ نے طور پر اپنا جلوہ دکھایا، پہاڑ جل گیا اور موسیٰ علیہ السلام بے ہوش کر رہ گئے۔ اس شعر میں علامہ اقبال کہتے ہیں کہ میں ایک چھوٹے دل والا معمولی انسان ہوں مگر میری تمنا بہت بڑی ہے۔ اور میں بھی موسیٰ کی طرح خدا کو دیکھنے کا متمنی ہوں اور چاہتا ہوں کہ میرے اس اصرار کے جواب میں بار بار لن ترانی کے الفاظ ادا کریں یوں میں محبوبِ حقیقی کے ساتھ ہم کلام ہو سکتا ہوں۔

کوئی دم کا مہماں ہوں اے اہلِ محفل

چراغِ سحر ہوں بجھا چاہتا ہوں

تشریح: علامہ کہتے ہیں کہ چند لمحوں کا مہمان ہوں۔ اپنی زندگی کے سفر کے اختتام پر ہوں، میری زندگی بہت تھوڑی رہ گئی ہے۔ میری مثال اس چراغ کی سی ہے جو ساری رات جلتا رہتا ہے اور صبح ہونے لگتی ہے تو وہ خود بخود بجھ جاتا ہے یا اسے بجھا دیا جاتا ہے۔ اس چراغ کی طرح میری زندگی بھی ختم ہونے والی ہے اور میں تم لوگوں میں زیادہ دیر رہ نہیں پاؤں گا۔ شاعر نے خود کو صبح کے چراغ سے تشبیہ دی ہے۔

بھری بزم میں راز کی بات کہہ دی

بڑا بے ادب ہوں سزا چاہتا ہوں

اس شعر میں شاعر محبوب حقیقی کو ایک راز قرار دیتے ہیں۔ لیکن شاعر کہتا ہے کہ میں نے یہ راز لوگوں پر کھول دیا ہے۔ اور مجھ سے ایک بہت بڑا ظلم سرزد ہو گیا ہے۔ اب اللہ تعالیٰ کی مرضی ہے کہ مجھے میرے جرم کی کیا سزا دی جاتی ہے۔ ویسے عام طور پر اس راز کے افشاء کرنے کی سزا سوائے موت کے اور کچھ نہیں۔

جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی

کھلتے ہیں غلاموں پر اسرارِ شہنشاہی!

جب عشق اپنی ذات کے پہچان کے طور طریقے سکھا دیتا ہے تو خودی کے مدارج میں انسان نیابت الٰہی کے درجے پر پہنچ جاتا ہے۔ ایسے میں غلاموں پر حکمرانی کے راز آشکار ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ تاریخ سے یہ بات ثابت ہے جب عربوں نے صدیوں کے غلامی سے نکل کر اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت اختیار کی تو انہوں نے آدھی سے زیادہ دنیا کو معجزاتی طور پر اپنے زیر نگیں کر لیا۔ اقبال دراصل اسی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ خودی کی طاقت اتنی عظیم ہے کہ غلام قوم بھی شہنشائی کے درجے پر پہنچ جاتی ہے۔

عطار ہو، رومی ہو، رازی ہو، غزالی ہو

کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحر گاہی!

علامہ اقبال اس شعر میں کہتے ہیں کہ عطار، رازی اور غزالی جیسے فلسفی بے شک بہت بڑے علماء اور مفکرین تھے لیکن ان کو بھی صرف علم کی بناء پر شہرت و معرفت نصیب نہیں ہوئی۔ صبح کی آہ و فریاد کے بغیر کسی کو کچھ نہیں مل سکتا۔ اس سے مراد یہ ہے کہ تنہا علم کا کچھ فائدہ نہیں جب تک اس میں خلوص اور خدا کی خوشنودی شامل نہ ہو۔ یعنی اقبال کے نزدیک علم کے ساتھ ساتھ مذہب پر کاربند رہنا بھی اشد ضروری ہے اور اسی صورت میں انسان اپنی عظمت کی آخری منزل پر پہنچ سکتا ہے۔

نومید نہ ان سے اے رہبر فرزانہ

کم کوش تو ہیں لیکن بے ذوق نہیں راہی

اے دانا رہبر! جو لوگ تیرے ساتھ سفر کر رہے ہیں۔ ان سے مایوس نہ ہو۔ وہ آرام طلب اور سست تو ہیں مگر ذوق و شوق سے خالی نہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ اے سمجھدار رہنما! تیرے ہمسفر بظاہر تن آسان نظر آتے ہیں لیکن مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ ان میں سرگرم سفر رہنے کا ذوق و شوق موجود ہے۔ اگر تھوڑی سی کوشش کی جائے تو ان میں یہ جذبہ ابھارا جا سکتا ہے۔ یہاں علامہ اقبال نے امتِ مسلمہ کی پر خلوص قیادت کو مخاطب کیا ہے اور ان کو بتانے کی کوشش کی ہے کہ قوم کی تنزلی سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ان لوگوں پر اگر محنت کی جائے تو یہ لوگ آگے بڑھنے کا ذوق و شوق رکھتے ہیں۔

اے طائر لاہوتی، اُس رزق سے موت اچھی

جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی!

تصوف میں روحانیت کے مختلف مدارج ہیں۔ پہلا درجہ ناسوت، دوسرا ملکوت، تیسرا لاہوت اور آخری درجہ فنافی اللہ ہے۔ علم تصوف میں لاہوت ایک ایسا مقام ہے۔ جہاں ذات باری تعالیٰ کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ علامہ کہتے ہیں اے لاہوتی پرندے ایسے رزق سے تو موت اچھی ہے جس کی خاطر تمہیں اپنی پرواز میں خامی پیدا کرنی پڑے۔ یعنی تو خوراک کی تلاش میں بلندیوں کو چھوڑ کر پستیوں کی طرف اتر آئے۔ علامہ کہنا چاہتے ہیں کہ جو رزق انسان کو سچائی اور اللہ کے راستے سے ہٹا دے اسے قبول کرنے کی بجائے مر جانا اچھا ہے۔

آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بیباکی

اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

علامہ اقبال کہتے ہیں کہ جوانمردوں کا شیوہ یہ ہے کہ سچی بات کہیں اور کسی سے خوفزدہ نہ ہوں۔ کیونکہ اللہ کے شیروں کو لومڑی کے سے مکر و فریب کے طریقے زیب نہیں دیتے۔ علامہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ حق پرست لوگ سچائی کی خاطر اپنی جان قربان کر دیتے ہیں۔ ایسے لوگ ہرگز مکر و فریب سے کام نہیں لیتے اور نہ خوفزدہ ہوتے ہیں۔ یہی چیز ان کے کردار کا خاصا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سچ صرف اللہ اور اس کا رسول ہی بول سکتے ہیں۔ سچ بولنا بہت مشکل ہے۔ صرف غیر معمولی جرات کے مالک افراد ہی نتائج کی پروا کیے بغیر سچ کہہ دیتے ہیں۔

حسرت موہانی

سید فضل الحسن نام، حسرت تخلص اور رئیس المتغزلین خطاب تھا۔ ضلع اناو کے قصبہ موہان میں 1875ء میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام سید اظہر حسن تھا۔ ابتدائی تعلیم حسبِ دستور مکتب میں پائی پھر علی گڑھ سے بی۔اے کا امتحان پاس کیا۔ انہوں نے اوائل عمری سے سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ انہوں نے ایک ادبی اور سیاسی پرچہ "اردوئے معلیٰ" جاری کیا۔ اس میں ایک مضمون کی اشاعت کے پاداش میں حکومت نے ڈیڑھ سال کی قید بامشقت کی سزا دی۔ پہلے کانگرس میں اور پھر مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ قیام پاکستان کے بعد بھارت میں ہی رہے۔ سولہ بار حج بیت اللہ کیا۔ انہوں 13 مئی 1951ء کو لکھنو میں وفات پائی ۔غزلوں کے چار دیوان شائع ہو چکے ہیں۔

شاعری کا جائزہ

حسرت بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ ان کی غزلوں کا ہر مجموعہ اردو غزل کی تاریخ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ بڑی مشکل زندگی گزارنے کے باوجود انہوں نے غزل کے دامن کو مالا مال کر دیا ہے۔ ان کی غزل کے عناصر ترکیبی میں عشق، خلوص، معصومیت، دل سوزی شامل ہیں۔ انہوں نے غزل کو ایک مخصوص رنگ دیا۔ جس میں میں روایت کی پیروی کے ساتھ ساتھ جدید تصورِ عشق سے بھی اردو شاعری کو آشنا کیا۔

تصور حسن و عشق:

ان کی غزل میں تصورِ حسن و عشق بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اور حسن و عشق کی روح ان کی ساری شاعری میں جاری و ساری ہے۔ نتیجہ کے طور پر حسن و عشق اور ان کے متعلقات کے کئی پہلو نکھر کر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں محبوب کے ناز و ادا کی صاف و شفاف تصویریں جگہ جگہ نظر آتی ہیں۔

لایا ہے دل پہ کیسی خرابی
اے یار تیرا حسنِ شرابی

تصورِ محبوب

حسرت کا محبوب چالاک اور بازاری نہیں بلکہ ایک باحیا، شریف اور مہذب محبوب ہے۔ حسرت نے پہلی مرتبہ اردو شاعری میں متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے ایک عام گوشت پوست کے انسان کا تصور محبوب روشناس کرایا۔ جس میں شرم و حیا کے ساتھ ساتھ عشق کی سختیاں برداشت کرنے کا حوصلہ بھی موجود ہے۔ حسرت کی شاعری میں عاشق اور معشوق دونوں عشق کی سختیاں برداشت کرتے ہیں:

وقتِ رخصت الوداع کا لفظ کہنے کے لیے
وہ تیرا رو رو کے بھی مجھ کو رُلانا یاد ہے

معاملہ بندی

جرات مصحفی اور داغ کے رنگ میں معاملہ بندی کے شعر کہتے وقت بھی حسرت تہذیب کے دائرے کے اندر رہتے ہیں۔ اپنے پیش رووٴں اور ہم عصروں سے زیادہ مہذب اور سنجیدہ ہوتے ہیں۔ حسن و عشق کے ان نازک معاملات کا ذکر کرتے وقت بھی وہ محبوب کی حرمت اور عاشق کے وقار کا پاس رکھتے ہیں۔

اللہ رے جسمِ یار کی خوبی کہ خود بخود

رنگینیوں میں ڈوب گیا پیراہن تمام

سیاسی رنگ

حسرت نے ساری عمر نہایت سرگرمی کے ساتھ ملکی سیاست میں حصہ لیا۔ قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ چنانچہ وہ اپنی شاعری میں سیاسی مسائل پر کھلم کھلا اظہارِ خیال کرتے ہیں۔ ان سیاسی موضوعات کی آمیزش نے ان کی غزل کو زیادہ مقبول بنادیا ہے۔ انہی سیاسی سرگرمیوں کی بناپر انہیں "رئیس الاحرار" کالقب بھی دیا گیا۔

ہم قول کے صادق ہیں اگر جان بھی جاتی
واللہ کہ ہم خدمت انگریز نہ کرتے
ہے مشقِ سخن جاری چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

غزلیات بمع تشریح

پھر بھی ہے تم کو مسیحائی کا دعویٰ دیکھو
مجھ کو دیکھو مرے مرنے کی تمنا دیکھو

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے یہ معجزہ عطافرمایا تھا کہ وہ بیماروں کو شفابخشتے اور مردوں کو زندہ کر دیتے تھے۔ شاعر کہتا ہے اے محبوب! میری طرف دیکھو، تمہارے عشق میں مبتلا ہو کر میرا براحال ہو گیا ہے میں اس قدر تکلیف دہ زندگی گزار رہا ہوں کہ ایسی زندگی سے گھبرا کر مرنے کی تمنا کر رہا ہوں۔ ایسے حالات میں جب تمہیں مسیحائی کا دعویٰ ہے کم از کم اپنے اس بیمار کا علاج ضرور کرنا چاہیے۔ کیونکہ محبوب کی ایک مسکراہٹ عاشق کو دوبارہ زندگی کی طرف واپس لاسکتی ہے۔

ہم نہ کہتے تھے بناوٹ سے ہے سارا غصہ
ہنس کے لو پھر وہ انہوں نے ہمیں دیکھا دیکھو

شاعر کہتا ہے کہ میں نہ کہتا تھا کہ ہمارے محبوب کا غصہ مصنوعی ہے۔ وہ ہم سے ہرگز ناراض نہیں۔ یہ صرف دکھاوے کا غصہ ہے۔ اگر یقین نہ آئے تو خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لو کہ آج پھر وہ ہماری طرف ہنس کر دیکھ رہا ہے۔ یعنی شاعر کے نزدیک محبوب کا غصہ دوسروں کو دکھانے کے لیے ہوتا ہے۔ حالانکہ دل ہی دل میں وہ مجھے سے محبت کرتا ہے۔

گھر سے ہر وقت نکل آتے ہو کھولے ہوئے بال
شام دیکھو نہ مری جان سویرا دیکھو

شاعر کہتا ہے کہ اے محبوب تم نہ اس بات کا خیال رکھتے ہو کہ یہ دن کا وقت ہے یا شام کا وقت ہے۔ بال کھولے ہوئے گھر سے باہر نکل آتے ہو۔ جس طرح محبوب کا بالوں میں کنگھی کرنا، انہیں بنانا سنوارنا حسن میں اضافے کا باعث بنتا ہے۔ اسی طرح کھلے بال بھی دیکھنے والے کے دل و دماغ کو بری طرح پریشان کر دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ محبوب کے اس طرح گھر سے باہر نکلنے پر کئی لوگ اور خاص طور پر عاشق دل تھام کر رہ جاتا ہے۔

سامنے سب کے مناسب نہیں ہم پہ یہ عتاب

سر سے ڈھل جائے نہ غصے میں دوپٹا دیکھو

شاعر کہتا ہے کہ اے محبوب! سب لوگوں کے سامنے اس طرح ہم سے ناراضگی کا اظہار کرنا مناسب نہیں۔ تنہائی میں جو جی چاہے کہہ لو ہم برا نہیں مانیں گے۔ ویسے بھی دوسروں کے سامنے ایسا کرنے سے تمہاری رسوائی ہوگی۔ کیونکہ لوگ کہیں گے کہ تم بد مزاج اور غصے والے ہو۔ دوسروں سے گفتگو کا سلیقہ نہیں بد زبان ہو۔ ہاں اس بات کا بھی خیال رکھو کہ غصے کی حالت میں کہیں تمہارے سر سے دوپٹا نہ اتر جائے۔ اس طرح تم بے پردہ ہو جائے گا اور تمہاری عزت پر حرف آئے گا۔

سر کہیں، بال کہیں، ہاتھ کہیں، پاؤں کہیں
ان کا سونا بھی ہے کس شان کا سونا دیکھو

شاعر کہتا ہے کہ میرے محبوب کے سونے کا انداز بھی دنیا جہاں کے محبوبوں سے انوکھا ہے۔ اس کا سر کہیں ہوتا ہے تو بال کہیں اور ہوتے ہیں۔ ہاتھ کہیں ہوتے ہیں تو پاؤں کہیں اور ہوتے ہیں۔ یعنی وہ نہایت بے فکری سے ہاتھ پاؤں پھیلا کر سوتا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اٹھی ہوئی جوانی ہے اور جوانی میں نیند اس قدر گہری ہوتی ہے کہ سونے کی حالت میں اپنے بند کا ہوش نہیں رہتا۔ اس لیے شاعر کہتا ہے کہ دیکھو میرا محبوب کس نرالی شان سے سوتا ہے۔ اس کا سونے کا انداز بڑا دلفریب ہے۔ دیکھنے والے کے دل پر خنجر چل جاتے ہیں۔ غرض اس کا ہر انداز پیارا ہے۔

ہوسِ دید مٹی ہے نہ مٹی گی حسرت
دیکھنے کے لیے چاہو انہیں جتنا دیکھو

حسرت کہتے ہیں کہ محبوب کو دیکھنے کی خواہش نہ کبھی ختم ہوئی ہے اور نہ کبھی ختم ہوگی۔ محبوب کو جتنا بھی دیکھو اس کو دیکھنے کے شوق میں کمی واقع نہیں ہوتی۔ جی نہیں بھرتا۔ بلکہ اسے دیکھنے سے آتشِ شوق اور بھڑکتی ہے۔ دنیا کی ہر دلچسپی سے ایک نہ ایک دن جی سیر ہو جاتا ہے لیکن محبت کا جذبہ ھل من مزید یعنی اور لاؤ کا تقاضا کرتی ہے۔ عمر گزرنے کے ساتھ انسان کے سارے قویٰ ایک ایک کر کے جواب دے جاتے ہیں مگر عشق کی آگ کی تپش میں کوئی فرق نہیں آتا۔

چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے
ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانہ یاد ہے

شاعر کہتا ہے کہ ہمیں عاشقی کا وہ زمانہ یاد ہے جب ہم نے شرابِ محبت پہلی بار پی تھی۔ ہم محبوب کی جدائی میں دوسروں کی نظروں سے چھپ کر چپکے چپکے دن رات آنسو بہایا کرتے تھے۔ یعنی محبوب ہماری طرف متوجہ نہیں ہوتا تھا۔ وہ بے رخی اور بے وفائی کا مظاہرہ کرتا تھا اور ہم اس کی یاد میں ہر وقت روتے رہتے تھے۔

تجھ سے کچھ ملتے ہی وہ بیباک ہو جانا مرا
اور ترا دانتوں میں وہ انگلی دبانا یاد ہے

شاعر کہتا ہے کہ اے محبوب خدا جانے وہ کیا بات تھی کہ جب کبھی تو لطف و کرم کی نظروں سے میری طرف دیکھا تو مجھے اپنے اوپر قابو نہیں رہتا تھا، میں بے باک ہو جاتا تھا مجھ پر بے خودی طاری ہو جاتی تھی اور نہ جانے میں کیا کچھ کہہ جاتا تھا اور میری باتیں سن کر تو اپنے دانتوں میں انگلی دبا لیتا تھا۔ یعنی حیران ہو جاتا تھا کہ میں کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہا ہوں۔

کھینچ لینا وہ مرا پردے کا کونا دفعتاً

اور دوپٹے سے ترا وہ منہ چھپانا یاد ہے

شاعر کہتا ہے کہ اے محبوب! تو پردے کے پیچھے چھپا ہوتا تھا اور تجھے دیکھنے کے شوق میں میں اچانک پردے کا کونا کھینچ لیتا تھا۔ شرم و حیا کی وجہ سے تو اپنا چہرہ چھپالیتا تھا۔ اپنا چہرہ ڈھانپ لیتا تھا۔ یہ واقعہ اب بھی مجھے یاد ہے۔ یہاں محبوب کے فطری اور خاندانی شرم و حیا کو خوبصورت پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔

تجھ کو جب تنہا کبھی پانا تو ازراہ لحاظ

حالِ دل باتوں ہی باتوں میں جتانا یاد ہے

شاعر کہتا ہے کہ اے محبوب، مجھے وہ منظر اب بھی یاد ہے کہ جب میں تجھے اکیلا پا کر باتوں ہی باتوں میں نہایت مودب انداز سے تجھے اپنے دل کا حال سناتا تھا۔ ظاہر ہے کہ ہر وقت تو تنہائی میسر نہیں آتی۔ خوش نصیبی کے ایسے لمحات کبھی کبھی میسر آتے ہیں جب محبوب بالکل اکیلا ہو اور عاشق اسے اپنا حال دل سنا سکے۔

دوپہر کی دھوپ میں میرے بلانے کے لیے

وہ ترا کوٹھے پہ ننگے پاؤں آنا یاد ہے

اے محبوب مجھے وہ وقت ابھی طرح یاد ہے جب تو دوپہر کے وقت تپتی ہوئی چھت پر ننگے پاؤں مجھے بلانے کے لیے آتا تھا۔ گرمیوں میں دوپہر کو اکثر لوگ سوجاتے ہیں۔ اس طرح محبوب کے سب گھر والے جب میٹھی نیند سورہے ہوتے تھے تو شاعر کو بلانے کے لیے اپنے کوٹھے پر ننگے پاؤں آتا تھا تاکہ کچھ دیر پیار اور محبت کی باتیں کر سکیں۔ ننگے پاؤں آنے کی بظاہر وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ کوئی پاؤں کی آہٹ نہ سن پائے۔

باوجودِ ادعائے اتقا حسرت مجھے

آج تک عہدِ ہوس کا وہ فسانہ یاد ہے

مولانا حسرت موہانی کہتے ہیں کہ اے حسرت! پرہیز گار ہونے کے دعویٰ کرنے کے باوجود مجھے آج تک عہد ہوس کی ساری کہانی یاد ہے۔ یعنی اگرچہ اب میں متقی اور پرہیز گار بن گیا ہوں مگر اب بھی وہ زمانہ نہیں بھولا جب میں محبوب کی تلاش میں مارا مارا ادھر اُدھر پھرتا تھا۔ اور مشکل دور ہونے کے باوجود وہ میری زندگی کا حسین ترین دور تھا جس کو فراموش کرنا میری بس سے باہر ہے۔

ناصر کاظمی

نام سید ناصر رضا اور تخلص ناصر تھا۔ جبکہ ناصر کاظمی کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان کا خاندانی تعلق امام موسیٰ کاظم سے تھا۔ 8 دسمبر 1925ء کو وہ انبالہ (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام محمد سلطان تھا اور وہ فوج میں صوبیدار میجر تھے۔ ناصر نے ابتدائی تعلیم شملہ اور انبالہ میں حاصل کی۔ اسلامیہ کالج لاہور سے ایف۔ اے کیا۔ شروع میں دفتر روزبار میں ملازمت کی اور پھر "اوراق نو"، "ہمایوں" اور "ہم لوگ" سے وابستہ ہو گئے۔ زندگی کے آخری چند برس ریڈیو پاکستان سے وابستہ رہے۔ معدے کے سرطان کی وجہ سے جنوری 1972ء میں لاہور میں وفات پائی۔ دیوان، برگ نے، خشک چشمے کے کنارے، سر کی چھایا اور پہلی بارش ان کے مجموعہ کلام ہیں۔

ناصر کاظمی کی غزل گوئی

ترقی پسند تحریک اور قیام پاکستان کی درمیانی مدت میں جب نظم گوئی کا میلان زیادہ زوروں پر تھا، ناصر عین اس زمانے میں غزل کا پرچم بلند کیا اور اس صنف کو دوبارہ زندہ کیا۔ اپنے تمام ہم عصروں میں ناصر کو اہم مقام حاصل ہے۔ ان کی غزل قدیم اور جدید کا بہترین سنگم ہے۔

میریت کا احیاء

ناصر کاظمی کو اردو غزل کی قدیم روایت کا آخری شاعر ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ اس نے غزل کے تن نازک میں زندگی کی نئی لہر دوڑادی۔ ان پر میر تقی میر کے اثرات کو بخوبی محسوس کیا جاسکتا ہے۔

شور برپا ہے خانۂ دل میں
کوئی دیوار سی گری ہے ابھی

تمثال نگاری:

ناصر کے ہاں سلیس اور آسان زبان اور بہترین تشبیہات و استعارات کے ساتھ ساتھ تمثال کی بھی بہترین مثالیں ملتی ہیں۔ ناصر تمثال کاری کے ذریعے ایک طلسماتی فضا پیدا کر دیتے ہیں۔

سو گئے لوگ اس حویلی کے
ایک کھڑکی مگر کھلی ہے ابھی
ہمارے گھر کی دیواروں پہ ناصر
اداسی بال کھولے سو رہی ہے

یاد ماضی

ان کی ساری شاعری ماضی کی تلخ یادوں، جدائی کے غموں اور پرانی محفلوں سے بچھڑ جانے کے دکھ سے بھری پڑی ہے۔ ہجرت کے بعد اپنے ماضی سے کٹ جانے کا دکھ ان کی شاعری کا بنیادی خاصا ہے:

وہ دوستی تو خیر اب نصیب دشمناں ہوئی
وہ چھوٹی چھوٹی رنجشوں کا لطف بھی چلا گیا

تقسیم ملک کے اثرات

برصغیر کی تقسیم کے بعد سماجی زندگی میں ایک عظیم انقلاب برپا ہوا۔ اس کے جو اثرات ہمارے معاشرے پر پڑے۔ ناصر نے انہیں اپنی غزل کا موضوع بنایا ہے۔ چنانچہ شہروں کی ویرانی، اخلاقی قدروں کی پامالی، معاشرتی انتشار اور بے یقینی کے موضوعات ناصر کے ہاں غزل کی رمز و ایما کی زبان میں ادا ہوئے ہیں:

اے میرے مجبور خدا　　اپنی دنیا دیکھ ذرا
فصلیں جل کر راکھ ہوئیں　　نگری نگری کال پڑا
اتنی خلقت کے ہوتے　　شہروں میں ہے سناٹا

غزلیات بمع تشریح

گئے دنوں کا سراغ لے کر کدھر سے آیا، کدھر گیا وہ
عجیب مانوس اجنبی تھا، مجھے تو حیران کر گیا وہ

وہ محبوب جو دل کو پسند آ جائے، اجنبی ہونے کے باوجود یوں لگتا ہے جیسے ہم اسے برسوں سے جانتے ہیں۔ یہی حقیقت پیشِ نظر رکھتے ہوئے شاعر کہتا ہے کہ ایک اجنبی جو کچھ جانا پہچانا سا لگا۔ گزرے ہوئے دونوں کا سراغ لے کر نہیں معلوم وہ کہاں سے آیا تھا اور کس طرف چلا گیا۔ اس بات پر میں بہت حیران پریشان تھا کہ اجنبی ہونے کے باوجود میرے ماضی کے بارے میں وہ کچھ جانتا تھا۔ نہیں معلوم وہ کون تھا جو مجھے ایک جھلک دکھا کر پریشان کر گیا۔ اب میں ہر وقت اسی کے بارے میں سوچتا ہوں

بس ایک موتی سی چھب دکھا کر بس ایک میٹھی سی دھن سنا کر
ستارۂ شام بن کے آیا، برنگِ خواب سحر گیا وہ

اس شعر میں ایک پردیسی سے پہلی نظر کی محبت کی کسک کا حال بیان کیا گیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ وہ محبوب بڑے ناز و ادا سے چلتا ہوا میرے سامنے سے گزرا۔ مجھے یوں لگا جیسے کوئی موتی چمکا ہو۔ اس نے ایک میٹھا سا نغمہ سنایا یعنی بڑی رسیلی آواز میں کچھ گفتگو کی اور پھر شام کے ستارے کی طرح غائب ہو گیا۔ یا یوں کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح صبح کے وقت خواب ذرا سی دیر کو آتا ہے اور پھر دن نکل آنے سے وہ خواب ادھورا ہی رہ جاتا ہے۔ اسی طرح مجھے یوں لگا جیسے وہ صبح کے وقت خواب میں آیا تھا۔ ابھی جی بھر کے دیکھا بھی نہ تھا کہ وہ چلا گیا۔

خوشی کی رُت ہو کہ غم کا موسم، نظر اسے ڈھونڈتی ہے ہر دم
وہ بوئے گُل تھا کہ نغمۂ جاں، مرے تو دل میں اتر گیا وہ

شاعر کہتا ہے کہ اب خوشی اور مسرت کا موسم ہو یا غم اور دکھ کا زمانہ ہو میری نظر ہر وقت اس اجنبی کو تلاش کرتی رہتی ہے۔ سوچتا رہتا ہوں کہ وہ کون تھا اور کہاں چلا گیا۔ وہ پھول کی خوشبو کی طرح تھا یا کوئی روح کو سکون بخشنے والے گیت کی طرح تھا۔ اس نے اپنی خوشبو اور میٹھی میٹھی باتوں سے مجھے اپنا گرویدہ بنایا ۔ وہ تو میرے دل میں بس گیا ہے۔ اب اس سے ملے بغیر مجھے قرار نہیں آتا۔ میری نظریں اس کے دید کی پیاسی ہیں لیکن وہ کہیں نہیں مل رہا۔

کچھ اب سنبھلنے لگی ہے جاں بھی، بدل چلا رنگِ آسماں بھی
جو رات بھاری تھی ٹل گئی ہے، جو دن کڑا ہے گزر گیا وہ

شاعر کہتا ہے کہ اب صورتِ حال کچھ بہتر ہو رہی ہے۔ اس کی جدائی برداشت کرنے کی عادت ہو گئی ہے۔ اب میری طبیعت کچھ کچھ سنبھلنے لگی ہے۔ زندگی معمول کی پر آگئی ہے۔ اب آسمان کا رنگ بھی کچھ کچھ بدلنے لگا ہے یعنی معلوم ہوتا ہے کہ قسمت مہربان ہونے لگی ہے کیونکہ مشکل رات گزر گئی ہے۔ جس طرح پہلے رات انگاروں پر لوٹتے ہوئے گزری تھی اب وہ کیفیت نہیں رہی اور وہ جو سخت دن تھا وہ بھی گزر گیا ہے یعنی سارا دن اس کی سوچوں میں کھویا رہتا تھا اور اب وہ حالت نہیں رہی۔

شکستہ پا راہ میں کھڑا ہوں، گئے دنوں کو بلا رہا ہوں

جو قافلہ میرا ہمسفر تھا، مثالِ گردِ سفر گیا وہ

زندگی کی راہ پر چلتے چلتے میرے پاؤں زخمی ہو گئے ہیں۔ اب میں چلنے کے قابل نہیں رہا۔ اس لیے راستے میں کھڑا ہو کر ماضی کے حسین دنوں کو یاد کر رہا ہوں کہ کاش وہ دن لوٹ آئیں۔ میں تنہا رہ گیا ہوں۔ جس قافلے میں شامل کر میں سفر کر رہا تھا وہ قافلہ سفر کے گرد و غبار کی طرح نظروں سے اوجھل ہو گیا ہے۔ مراد یہ ہے کہ میری زندگی کے کئی ساتھی، کئی دوست کئی عزیز و اقارب مجھ سے بچھڑ گئے ہیں۔

بس ایک منزل ہے بوالہوس کی ہزار رستے ہیں اہلِ دل کے

یہی تو فرق مجھ میں، اس میں، گزر گیا میں، ٹھہر گیا وہ

اس شعر میں لالچی اور مخلص شخص میں فرق بتایا گیا ہے شاعر کہتا ہے کہ لالچی شخص کی طرف ایک ہی منزل ہوتی ہے جبکہ مخلص شخص کے لیے ہزاروں راستے کھلے ہوتے ہیں۔ لالچی شخص اور مجھ میں یہی تو فرق ہے۔ لالچی شخص منزل پر پہنچ کر ٹھہر گیا لیکن میں بے نیاز منزل سے آگے بڑھ گیا۔ شاعر یہ کہنا چاہتا ہے کہ خود غرض اور مطلب پرست شخص کا جب مطلب نکل جاتا ہے تو تعلق بھی ختم کر دیتا ہے جبکہ مخلص شخص کی دوستی برقرار رہتی ہے کیونکہ اس کی کوئی منزل یا غرض نہیں ہوتی۔ ابوالہوس سے یہاں رقیب بھی مراد لیا جا سکتا ہے۔

وہ ہجر کی رات کا ستارہ وہ ہم نفس ہم سخن ہمارا

سدا رہے اس کا نام پیارا سنا ہے کل رات مر گیا وہ

اپنے ایک دوست کی وفات پر اظہارِ تعزیت کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے کہ دنیا میں میرا ایک ہی دوست باقی بچا تھا۔ وہ میرا مونس و غم خوار تھا۔ میرے دکھ سکھ میں ہمیشہ شریک رہتا تھا۔ اب وہ شخص کل رات میرا وہ واحد دوست بھی مر گیا ہے اور میں بالکل اکیلا رہ گیا ہوں۔

وہ رات کا بے نوا مسافر، وہ تیرا شاعر وہ تیرا ناصر

تری گلی تک تو ہم نے دیکھا تھا، پھر نجانے کدھر گیا وہ

شاعر کہتا ہے کہ اے محبوب، وہ تیرا چاہنے والا شاعر جس کا نام ناصر ہے وہ رات کے غریب اور بے کس مسافر کی طرح تیری تلاش میں مارا مارا پھرتا رہتا تھا۔ تیری تلاش میں ہم نے اسے تیری گلی تک پہنچنے میں کامیاب ہوتے تو دیکھا۔ نہیں معلوم دیوانگی کی حالت میں تیری تلاش میں وہ پھر کس طرف چلا گیا۔ ممکن ہے صحرا کی طرف چلا گیا ہو اور وہاں گھوم پھر رہا ہو۔ شاعر یہ بتانا چاہتا ہے کہ دیوانے عاشق اپنی منزل پر پہنچ کر بھی منزل تک نہیں پہنچ پاتے۔ اپنے مقصد میں کامیاب ہوتے ہوئے بھی ناکام ہو جاتے ہیں۔

کسی کلی نے بھی دیکھا نہ آنکھ بھر کے مجھے

گزر گئی جرس گل اداس کر کے مجھے

لفظ کلی استعارہ کے طور پر نرم و نازک اور نوجوان محبوب کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ شاعر کو اس بات کی حسرت ہی رہی کہ کوئی خوبصورت، پھول سے نازک بدن والا محبوب اس کی محبت کا جواب محبت سے دیتا۔ چنانچہ کہتا ہے کہ کسی بھی کلی نے میری طرف پیار بھری نظروں سے نہیں دیکھا۔ میں نے پھول کی گھنٹی

کی آواز تو سنی یعنی حسینوں کے بے پناہ حسن سے متاثر تو ہوا۔ مجھے کلیوں سے محبت ہوئی لیکن کسی حسین کلی نے میرے جذبہ عشق کے خلوص کی قدر نہ کی۔ دوسری طرف شاعر کی مراد جرس گل سے بہار کا موسم ہے یعنی شاعر کا کہنا ہے کہ میری زندگی میں اچھے دن داخل ہوئے لیکن ان اچھے دنوں میں بھی مجھے کچھ حاصل نہ ہو پایا

میں سو رہا تھا کسی یاد کے شبستاں میں
جگا کے چھوڑ گئے قافلے سحر کے مجھے

شاعر کہتا ہے کہ میں دنیاومافیہا سے بے خبر کسی کی یاد میں کھویا ہوا سو رہا تھا کہ صبح کا قافلہ آ گیا یعنی دل نکل ایا اور صبح کے وقت پرندوں کے شور کرنے سے میری آنکھ کھل گئی۔ یعنی صبح کا یہ قافلہ مجھے بیدار کر کے خود تو چلتا بنا۔ اس طرح میرا سہانا سپنا ٹوٹ گیا۔ محبوب کے تصور سے مجھے جو سکون مل رہا تھا وہ سب ختم ہو گیا۔ اب میں جاگ اٹھا اور ایک بار پھر اداسیاں میرا مقدر بن گئیں۔

میں رو رہا تھا مقدر کی سخت راہوں میں
اڑا کے لے گئے جادو تری نظر کے مجھے

محبوب، میں قسمت کے دشوار گزار راہوں پر چلتے ہوئے اپنی محرومی قسمت پر آنسو بہا رہا تھا کہ تیرا خوبصورت چہرہ مجھے نظر آیا۔ تیری نظروں کا جادو مجھے کہیں سے کہیں اڑا کے لے گیا۔ پہلے میں اپنی قسمت کو رو رہا تھا۔ اب میں خود کو بہت خوش نصیب سمجھنے لگا۔ اس طرح ایک مشکل تو آسان ہو گئی لیکن تیرے حسن کے حصار میں پھنس کر میں پہلے سے بھی زیادہ اداس اور غمزدہ ہو گیا کیونکہ مجھے تیرا حاصل کرنا خاصا مشکل نظر آ رہا تھا۔ گویا "آسمان سے گرا ہوا کھجور میں اٹکا" کے مصداق شاعر ایک پریشانی سے نکل کر ایک دوسری پریشانی کا شکار ہو گیا۔

میں تیرے درد کی طغیانیوں میں ڈوب گیا
پکارتے رہے تارے ابھرے ابھر کے مجھے

شاعر کہتا ہے کہ اے محبوب میں تیری جدائی کے درد کے طوفان میں ڈوب گیا۔ اگرچہ تارے ابھر ابھر کر مجھے پکارتے رہے کہ اگر میں جواب دے کر انہیں اپنے غرقاب ہونے کا پتہ دوں تو وہ میری مدد کو پہنچیں لیکن پھر اوپر نہ ابھر سکا۔ پھر وہ میری مدد کو کیسے پہنچتے؟ اس کا مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جب انسان کسی کے عشق میں ڈوب جاتا ہے تو اپنے خارجی ماحول سے مکمل طور پر کٹ کر رہ جاتا ہے۔

ترے فراق کی راتیں کبھی نہ بھولیں گی
مزے ملے انہیں راتوں میں عمر بھر کے مجھے

ہجر و وصل کی کیفیتوں کا مزہ جدا جدا ہوتا ہے۔ وصل اگر سکون کا باعث بنتا ہے تو جدائی تڑپ پیدا کرتی ہے۔ عاشق ان دونوں کیفیتوں سے یکساں طور پر لطف اندوز ہوتا ہے۔ چنانچہ محبوب سے مخاطب ہو کر شاعر کہتا ہے کہ اے محبوب! میں نے تجھ سے جدا رہ کر جو راتیں گزاری ہیں انہیں میں زندگی بھر نہیں بھلا سکتا۔ سچ تو یہ ہے کہ انہی جدائی کی راتوں میں مجھے زندگی کا سچا لطف حاصل ہوا ہے۔ تیری جدائی میں تڑپ کر ہی حقیقی سکون ملا۔ دوسری بات یہ ہے کہ جدائی ہی کے وقت وصل کی لذت کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔

ذرا سی دیر ٹھہرنے دے اے غم دنیا
بلا رہا ہے کوئی بام سے اتر کے مجھے

شاعر کہتا ہے کہ اے غم دنیا! مجھے تھوڑی دیر اور جینے دے کیونکہ کوئی میری حالت زار پر ترس کھا کر چھت سے نیچے اتر کر مجھے اپنے پاس بلا رہا ہے۔ مجھے رکنے کے لیے کہہ رہا ہے۔ اس لیے تو مجھے کچھ مہلت دے۔ مجھے دنیا میں کچھ عرصہ زندہ رہنے دے تاکہ میں اسے مل لوں۔ ایسا نہ ہو بلانے والے کا دل ٹوٹ جائے۔

مثنوی

مثنوی عربی لفظ مثنیٰ سے نکلا ہے۔ جس کا مطلب دو دو علیحدہ کرنا ہے۔ اس سے مراد ہے وہ مسلسل نظم، جس کے ہر شعر میں دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوں اور تمام اشعار ایک ہی بحر میں ہوں۔ مثنوی میں ہر طرح کے خیالات، واقعات اور مطالب ادا ہوتے ہیں۔ اسی لحاظ سے یہ بڑی مفید اور وسیع صنفِ شعر ہے۔ خصوصاً واقعہ نگاری کے لیے سب سے زیادہ موزوں ہے۔ اخلاقی، مذہبی اور تاریخی موضوعات پر مثنویاں لکھی گئی ہیں۔ مثنوی میں قدرتی مناظر، معاشرتی رسوم و رواج، انسانی جذبات و احساسات وغیرہ کی خوبصورت مثالیں ملتی ہیں۔ مثنوی میں اشعار کی تعداد بھی مقرر نہیں ہوتی۔ فارسی میں سینکڑوں اور ہزاروں اشعار کی مثنویاں ملتی ہیں۔ مثنوی عموماً چھوٹی بحروں میں لکھی جاتی ہے۔ اردو میں مثنوی زیادہ تر قصہ یا داستان کے بیان کے لیے استعمال ہوئی ہے۔ مثنوی میں مضامین کی ایک خاص ترتیب ہوتی ہے۔ پہلے حمد و نعت و منقبت، پھر بادشاہ کی تعریف، اس کے بعد وجۂ تالیف اور اس کے بعد اصل قصہ یا داستان شروع ہوتی ہے۔ قصے میں قصہ گوئی کے تمام اجزائے ترکیبی یعنی پلاٹ، کردار نگاری، جذبات نگاری، سراپا نگاری، مکالمہ نگاری اور منظر نگاری، جزئیات نگاری سبھی پہلو پائے جاتے ہیں۔ ان کی تفصیل ذیل میں درج ہے۔

پلاٹ:

کسی بھی کہانی میں واقعات کی ترتیب کو پلاٹ کہا جاتا ہے۔ مثنوی کے قصے میں بھی پلاٹ کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ عموماً مثنویوں کے پلاٹ سادہ ہوتے ہیں اور قصہ ابتداء اور ارتقاء کی منزلوں سے گزرتا ہوا اختتام کو پہنچ جاتا ہے۔

کردار نگاری:

کردار کہانی کا اہم حصہ ہوتے ہیں اردو مثنویوں کے قصوں میں عام طور پر بادشاہ، شہزادے، شہزادیاں، وزیر زادے، کنیزیں، جادوگر، نجومی اور دیو، جن اور پری جیسے کردار ملتے ہیں۔ مافوق الفطرت کرداروں کے علاوہ انسانی کردار مثنوی میں اپنے وقت کی تہذیبی اور معاشرتی زندگی کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ کہانی چاہے کوئی بھی ہو کرداروں کے طور طریقے، عادات و اطوار، اعمال و اخلاق رہن سہن اور لباس و گفتگو وغیرہ مثنوی نگار کے ماحول اور زمانے کی آئینہ داری کرتے ہیں۔

جذبات نگاری:

مثنوی نگار کرداروں کے جذبات کی تمام باریکیوں کو اپنے پیش نظر رکھتا ہے۔ جب وہ کرداروں کی جذبات نگاری کرتا ہے تو صداقت اور حقیقت پسندی سے کام لے کر کرداروں کے حسبِ مراتب ان کے جذبات کی ترجمانی کرتا ہے، ان کی داخلی کیفیات، نفسیاتی الجھنوں کو بڑی مہارت سے پیش کیا جاتا ہے۔

مکالمہ نگاری:

مکالمہ نگاری داستانوی مثنویوں کی کامیابی کا ایک اہم پہلو ہے۔ مثنوی نگار کرداروں کی باہمی بات چیت کو جاندار مکالموں کی صورت میں پیش کرنے اور حسب موقع مختصر یا طویل مکالموں کو تشکیل دے کر کرداروں کے جذبات و خیالات کی عمدہ ترجمانی کرتا ہے۔

یہ سن سن کر وہ نازنیں مسکرا لگی کہنے اچھا بھلا ری بھلا
میں سمجھی تر اجی گیا ہے اُدھر بہانے تو کرتی ہے کیوں مجھ پہ دھر

محاکات نگاری:

کسی چیز کا ایسے بیان کہ جسے پڑھ کر اس کا جیتا جاگتا نقشہ آنکھوں میں پھر جائے محاکات کہلاتا ہے۔ جو کہ کسی بھی مثنوی کی بنیادی خصوصیت ہے۔

اِدھر اور ادھر آتیاں جاتیاں　　پھریں اپنے جوبن کو دکھلاتیاں

کہیں چٹکیاں اور کہیں تالیاں　　کہیں قہقہے اور کہیں گالیاں

منظر نگاری:

کسی قدرتی منظر یا واقعہ کے خارجی ماحول اور مادی عناصر کی آئینہ داری کو منظر کشی کہا جاتا ہے، داستانوی مثنویوں کے علاوہ دیگر مثنویوں میں بھی منظر نگاری کے انتہائی کامیاب نمونے مل جاتے ہیں۔

وہ چھٹکی ہوئی چاندنی جابجا　　وہ جاڑے کی آمد وہ ٹھنڈی ہوا

وہ نکھرا فلک اور وہ مہ کا ظہور　　لگا شام سے صبح تک وقتِ نور

جزئیات نگاری:

جزئیات نگاری کے ذریعہ فنکار اپنے ماحول، ملک و تہذیب کی رنگا رنگی اور کرداروں کے داخلی و خارجی حالات و کیفیات کی بولتی ہوئی تصویریں اتار کر رکھ دیتا ہے۔ اس کی مدد سے شاعر کسی چیز یا جذبے کی تمام تفصیلات کو بیان کرتا ہے جس سے منظر ہو یا واقعہ یا کردار اس کا جیتا جاگتا نقش نگاہوں میں پھرنے لگتا ہے۔

تنِ نازنین نم ہوا اس کا کل　　کہ جس طرح ڈوبے ہے شبنم میں گل

نہانے میں یوں تھی بدن کی چمک　　برسنے میں بجلی کی جیسے چمک

ارتقاء

عربی میں مثنوی کا وجود نہ تھا۔ یہ فارسی شعراء کی ایجاد ہے۔ نظامی، فردوسی، مولانا روم، سعدی، خسرو وغیرہ مشہور فارسی مثنوی نگار ہیں۔ مثنوی اُردو اصنافِ شعر کی قدیم ترین صنفِ شعر ہے۔ دکنی دور میں کثرت سے مثنویاں لکھی گئیں ہیں۔ اردو میں بہمنی دور کے شاعر فخر الدین نظامیؔ کی مثنوی "کدم راؤ پدم راؤ" سے صنف مثنوی کی ابتداء ہوئی۔ اس کے علاوہ رسمی کی خاور نامہ، نصرتی کی گلشنِ عشق، سراج کی بوستانِ خیال، ملا وجہی کی قطب مشتری اور محمود بحری کی من لگن مشہور ہیں۔ محمد قلی قطب شاہ، غواصی اور نشاطی کی مثنویات بھی اہم ہیں۔ بعد کے دور میں قابلِ ذکر مثنوی گو شعراء میں میر اثر، میر تقی میر، میر حسن، جرات اور مومن، دیا شنکر نسیم اور نواب مرزا شوق شامل ہیں۔

میر حسن کی مثنوی "سحر البیان" کے بعد مقبولیت اور معیار کے لحاظ سے دیا شنکر نسیم کی "گلزارِ نسیم" دوسرے نمبر پر ہے۔ اختصار اس کا سب سے بڑا وصف ہے۔ اس پر دبستانِ لکھنو کا رنگ غالب ہے۔ اس کے علاوہ مومن کی مثنوی جہاد، نواب مرزا شوق کی "فریبِ عشق"، "بہارِ عشق"، اور "زہر عشق" کے نام سے مثنویاں لکھیں۔ محسن کاکوروی کی نعتیہ مثنویوں میں صبح تجلی، چراغ کعبہ اور شفاعت نجات دلچسپ اور پر تاثیر ہیں۔

حالیؔ کے علاوہ دور جدید میں حفیظ جالندھری کا "شاہنامہ اسلام" ایک اچھی مثنوی ہے۔ علامہ اقبال کی مثنوی "ساقی نامہ" حقائق اور معارف کا ایک سمندر ہے۔

میر حسن

میر غلام حسن نام، حسن تخلص تھا۔ والد کا نام غلام حسین ضاحک تھا۔۱۷۳۶ء دلی میں پیدا ہوئے۔ ابھی بارہ ہی برس کی عمر تھی کہ والد کے ہمراہ فیض آباد آئے۔ اس وقت فیض آباد اودھ کا دارالحکومت تھا۔ جب آصف الدولہ نے لکھنو آباد کیا تو لکھنو منتقل ہو گئے۔ میر حسن نے باپ کے زیر نگرانی تعلیم حاصل کی۔ شاعری ان کے خون میں شامل تھی۔ جب تک دلی میں رہے تھے والد سے اصلاح لیتے رہے۔ اودھ میں میر ضیاء الدین کے شاگرد ہوئے۔ میر حسن کی تصانیف میں ایک دیوان اور ایک تذکرہ شعرائے ریختہ اور گیارہ مثنویاں ہیں لیکن ان سب مثنویوں میں سحر البیان سب سے زیادہ مقبول ہے۔ 1786ء میں انتقال کر گئے۔

مثنوی سحر البیان

اس مثنوی کو میر حسن نے 1782ء میں لکھ لیا تھا، اس وقت تک برصغیر میں چھاپہ خانہ نہیں آیا تھا، مگر کتاب عام ہوئی اور عوام و خواص میں اس کی شہرت ہو گئی، پھر فورٹ ولیم کالج کلکتہ نے 1803ء میں اسے چھاپہ خانہ سے چھاپ کر شائع کیا۔ میر حسن وہ پہلے شاعر ہیں جنہوں نے طبع زاد قصے سحر البیان کے ذریعے جاگیردارانہ طبقے کی مکمل تصویر پیش کی ہے۔

آغاز

مثنوی سحر البیان کا آغاز حمد، نعت اور منقبت سے متعلق اشعار کے سلسلے سے ہوتا ہے جو مثنوی کی روایت کے عین مطابق ہے۔ اس حصہ سے اس وقت کے مذہبی اقتدار اور عقائد کی جھلک ملتی ہے۔

پلاٹ:

سحر البیان ایک طویل مثنوی ہے لیکن پلاٹ کے اعتبار سے عمدہ ہے۔ واقعات کا سلسلہ نہایت مربوط ہے اور کہیں کوئی جھول نہیں ہے بیان میں ایسا تسلسل ہے جو کہ کہانی کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ یہ ایک طبع زاد قصہ ہے جو ہند آریائی قصوں پر مبنی ہے۔ سینہ بہ سینہ کئی قصوں میں بادشاہوں کے بے اولاد رہنے، نجومیوں کی پیشن گوئیوں کے مطابق صاحب اولاد بن جانے، کسی شہزادی کسی جن یا پری کے سائے میں آجانے جیسے توہمات یا شہزادے یا شہزادی کا قید میں پھنس جانے یا ان کے دوستوں کا بھیس بدل کر مدد کے لیے نکل پڑنے کے واقعات بیان کیے گئے ہیں۔

کردار نگاری:

میر حسن نے کردار نگاری کے اعتبار سے سحر البیان میں کمال مہارت کا مظاہر کیا ہے، مثنوی میں سب سے پہلے ہم بادشاہ کے کردار سے متعارف ہوتے ہیں، اس کے بعد کہانی کے ہیرو بے نظیر کا کردار آتا ہے۔ اس کے علاوہ کہانی کی ہیروئن بدر منیر اس کی سہیلی نجم النساء، پری ماہ رخ اور جنوں کے شہزادہ فیروز بخت کے کردار سامنے آتے ہیں۔ اس کے علاوہ کنیز اور رقاصاؤں وغیرہ کے کردار بھی ملتے ہیں۔ تمام کرداروں کے حلیے، ان کے جذبات اور عقل و شعور کو پیش کرنے میں میر حسن نے انتہائی مہارت اور فنکاری سے کام لیا ہے۔

لکھنوی تہذیب:

مثنوی سحر البیان میں لکھنوی تہذیب و معاشرت کی خوبصورت تصویریں دکھائی دیتی ہیں۔ درباری زندگی کے علاوہ اس دور کا رہن سہن، تہوار و تقریبات اور مختلف پکوانوں کا ذکر بھی اس مثنوی میں موجود ہے۔ خاص طور سے کرداروں کے لباس اور وضع قطع کا ذکر کیا جاتا ہے تو اس زمانے کے رہن سہن اور ملبوسات و زیورات وغیرہ کی تفصیلات سے ہمیں روشناس ہونے کا ملتا ہے۔

اور اک اوڑھنی جوں ہوا یا حباب — جسے دیکھ شبنم کو آوے حجاب
وہ کرتی میں انگیا جواہر نگار — نیا باغ اور ابتداء بہار

جذبات نگاری:۔

میر حسن کو جذبات نگاری میں کمال مہارت حاصل ہے، رحم ہو یا قہر، نفرت ہو یا محبت، رشک ہو یا رقابت، عشق ہو یار قابت ہر طرح کے جذبات کو مناسب موقع پر انھوں نے نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ شہزادہ کے استقبال کے موقع پر محل کے خدام اور کنیزوں کی خوشی کو انہوں نے کمال مہارت سے مثنوی میں پیش کیا ہے۔

جہاں تک کہ تھیں خادمانِ محل — خوشی سے وہ ڈیوڑھی تک آئیں نکل
بلائیں لگیں لینے سب ایک بار — کیا جی کو یک دست سب نے نثار

منظر نگاری:

منظر نگاری میں بھی میر حسن کو حد درجہ کامیابی حاصل ہے۔ اس منثوی میں منظر نگاری کے ان گنت مواقع آئے ہیں اور مصنف نے ہر جگہ اپنی مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ مثلاً

گلوں کا لبِ نہر پر جھومنا — اسی اپنے عالم میں منھ چومنا
چمن آتشِ گل سے دہکا ہوا — ہوا کے سبب باغ مہکا ہوا

جزئیات نگاری:۔

میر حسن نے جس واقعے کا بھی ذکر کیا اس کے ہر اک جز کو مکمل بیان کر دیا ہے۔ رقص کو مکمل جزئیات کے ساتھ وہ کچھ اس طرح سے پیش کرتے ہیں:

وہ گھٹنا وبڑھنا اداؤں کے ساتھ — دکھانا وہ رکھ رکھ کے چھاتی پہ ہاتھ

مکالمہ نگاری:۔

"سحر البیان" میں مکالمہ نگاری نہایت فطری انداز میں موجود ہے چونکہ میر حسن کے تجربات وسیع تھے اور انھوں نے مختلف طبقے کے لوگوں میں زندگی بسر کی تھی اس لئے ان کو مختلف لوگوں کی زبان سمجھنے کا موقعہ ملا۔ جب بدر منیر سے ملاقات کر کے بے نظیر رخصت ہونے لگا تو اس نے بدر منیر سے کہا۔

کہا اب پہر کی ہے رخصت مجھے — زیادہ نہیں اس سے فرصت مجھے

بدر منیر جواب دیتی ہے

مروتم پری پر، وہ تم پر مرے — بس اب تم ذرا مجھ سے بیٹھو پرے
یہ سن پاؤں پر گر پڑا بے نظیر — کہا کیا کروں آہ بدر منیر

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو در حقیقت میر حسن نے اس مثنوی کے ذریعے صاف ستھری اور سادہ زبان کو سلیقے کے ساتھ استعمال میں لاتے ہوئے اپنی استادی کا لوہا منوایا ہے۔ اس کے علاوہ مثنوی کی ہیئت اور ساخت کو بھی انہوں نے خوبی کے ساتھ نبھایا ہے۔

مثنوی سحر البیان تشریح

پلا ساقیا ساغرِ بے نظیر　　　　　　　　　　پھنسی دامِ ہجراں میں بدرِ منیر

تشریح: اے ساقی! تو مجھے لاجواب شراب دے کیوں کہ بدر منیر شہزادے بے نظیر کی جدائی کے جال میں پھنس گئی ہے۔ ظاہر ہے پریشان لوگوں کا حال لکھنے والے اور پڑھنے والے دونوں ہی پریشان ہو جاتے ہیں چونکہ یہ شعر ایک پریشان کن قصے کے ایک جزو کے آغاز کا شعر ہے اس لیے شاعر قصہ بیان کرنے سے پہلے شراب سے تقویت حاصل کر رہا ہے۔

وہ حسن و جوانی اور اُس پہ یہ غم　　　　　　　　　　ستم ہے، ستم ہے، ستم ہے، ستم

تشریح: یہ شعر بدر منیر کے بارے میں ہے جو شہزدہ بے نظیر سے محبت کرنے لگتی ہے۔ وہ پری جس نے شہزادے کو قید میں رکھا ہوتا ہے، اسے ان دونوں کے عشق کا پتہ چل جاتا ہے وہ شہزادے کو اب گھومنے پھرنے کے لیے طلسمی گھوڑے پر سیر کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔ شہزادے کی جدائی میں وہ بے پناہ حسن کی مالک اور جوان شہزادی بہت زیادہ غمگین ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ یہ بہت بڑا ظلم ہے۔ یہ تقدیر کی بہت بڑی زیادتی ہے۔

جہاں بیٹھنا آہ کرنا اُسے　　　　　　　　　　بہانا نزاکت پہ دھرنا اُسے

تشریح: شہزادے کی جدائی میں بدر منیر بہت زیادہ بے قرار تھی۔ اٹھتے بیٹھتے آہیں بھرتی تھی لیکن کسی پر ظاہر بھی نہیں کرنا چاہتی تھی کہ اس کے آہیں بھرنے کا سبب کیا ہے۔ یہ وہ ظاہر کرتی تھی کہ اپنی نازک طبعی کی وجہ سے ایسا کر رہی ہے۔

کبھی خون آنکھوں سے رو ڈالنا　　　　　　　　　　کسی کو کبھی دیکھ دھو ڈالنا

تشریح: زیادہ رونے سے آنکھیں سرخ ہو جاتی ہیں۔ ان سرخ اور سوجھی ہوئی آنکھوں سے آنسو بہانے کو شاعری کی زبان میں خون کے آنسو بہانا کہتے ہیں۔ چنانچہ کبھی بدر منیر اتنا روتی تھی کہ آنکھیں سرخ ہو جاتی اور سوج جاتی تھیں۔ اگر کوئی اسے آنسو بہاتے ہوئے دیکھ لیتا تو اپنے دل کی پریشانی پر پردہ ڈالنے کے لیے وہ آنسو پونچھ لیتی اور مسکرانے لگتی۔

خواصوں کو بالا بتانا اُسے　　　　　　　　　　اکیلی درختوں میں جانا اُسے

خاص خادماؤں جن کی یہ ذمہ داری تھی کہ وہ ہر وقت اس کے ساتھ رہیں اور ایک لمحے کے لیے بھی اسے تنہا نہ چھوڑیں، شہزادی بدر منیر انہیں جھانسا دے کر اکیلی درختوں کی اوٹ میں چلی جاتی تھی، تا کہ رو کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لے۔

و لے ان درختوں میں جس میں وہ ماہ　　　　　　　　　　سر شام چھپ چھپ کے کرتا نگاہ

تشریح: ماہ استعارہ کے طور پر شہزادہ بے نظیر کو کہا گیا ہے۔ لیکن جن درختوں میں شام ہوتے ہی وہ چاند سا شہزادہ اسے چھپ چھپ کر دیکھنے کے لیے آتا۔ یہ اس امید پر ان درختوں کے جھنڈ میں چلی جاتی تھی کہ شاید بے نظیر ادھر آنکلے۔ شہزادے کی آمد کا انتظار کرنے کے لیے وہ وہاں چلی جاتی۔

سو یہ بھی پہر دن سے آواں مدام — اسی چھاؤں میں بیٹھ کرتی تھی شام

ابھی تین گھنٹے دن باقی ہوتا تھا کہ یہ وہاں جا کر درختوں کے سائے میں شہزادے کا انتظار کرنے بیٹھ جاتی تھی۔

گیا اس طرح جب مہینہ گزر — کہ وہ ماہ مطلق نہ آیا نظر

تشریح: ماہ استعارہ کے طور پر شہزادے بے نظیر کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ اسی طرح انتظار کرتے کرتے جب ایک مہینہ گزرا مگر وہ چاند جیسا حسین شہزادہ بالکل نظر نہ آیا۔

اور اِس کا اِدھر رنگ گھٹنے لگا — جگر خوں ہو مژگاں پہ بٹنے لگا

تشریح: مثل مشہور ہے کہ انتظار موت سے بھی زیادہ شدید ہوتا ہے۔ انتظار کی زحمت اٹھاتے اٹھاتے اس کا رنگ روپ بگڑ گیا۔ غم کی شدت کی وجہ سے جگر خون ہو کر آنسوؤں کی شکل میں پلکوں پر جمنے لگا۔ وہ بیمار بیمار سی نظر آنے لگی۔

لگی رہنے تپ جان بیتاب میں — لگا فرق آنے خور و خواب میں

تب شہزادی بدر منیر کا دل بہت بے قرار رہنے لگا۔ نہ اسے ٹھیک طرح سے بھوک پیاس لگتی تھی اور نہ ٹھیک طرح نیند آتی تھی۔ یعنی اس کی نیند اڑ گئی تھی، اس کا کھانے پینے کو جی نہیں چاہتا تھا۔

محبت کا سودا سا ہونے لگا — جنوں تخم وحشت کا بونے لگا

تشریح: یوں لگتا تھا جیسے وہ محبت سے پاگل ہو گئی ہے۔ دیوانگی اس کے اندر وحشت کا بیج بونے لگی تھی۔ وہ انسانوں سے نفرت کرنے اور دور بھاگنے لگی تھی۔

سرکنے لگا پاس ناموس ننگ — لگی عقل اور عشق میں ہونے جنگ

تشریح: قاعدہ ہے کہ انسان عشق و محبت کا راز دوسروں سے چھپاتا ہے لیکن عشق اور مشک اپنی موجودگی کی خبر دے ہی دیتے ہیں۔ چنانچہ جب عشق کا راز فاش ہو جائے تو شرم و حیا رخصت ہو جاتے ہیں اور انسان کو اپنی عزت کا خیال نہیں رہتا۔ شہزادی بدر منیر کی عقل اور عشق میں جنگ چھڑ گئی۔ عقل حوصلے، برداشت اور صبر کا مظاہرہ کرنے کا مشورہ دیتی تھی جب کہ عشق انجام سے بے نیاز اپنے دل کی کیفیت کا اظہار چاہتا تھا۔

خوشی اٹھانے لگی دل میں شور — جتانے لگی ناتوانی بھی زور

تشریح: اگر انسان کسی کو اپنا ہمراز بنا لے تو یوں لگتا ہے جیسا اس کا غم کسی نے بانٹ لیا ہے اور اگر خاموشی اختیار کر لے تو ایک دن وہ خاموشی اسے چیخنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ کچھ اسی قسم کی کیفیت شہزادی بدر منیر کی بھی ہے۔ بھوک پیاس اور نیند رخصت ہو جانے، ہر وقت کی سوچوں اور شہزادے کی جدائی کے غم میں وہ دبلی پتلی اور کمزور ہونے لگی۔ یہاں تک کہ کمزوری نمایاں نظر آنے لگی۔

یہ احوال دیکھ اس کا دختِ وزیر — لگی جل کے کہنے کہ "بدرِ منیر"

تشریح: شہزادی کی ہمراز اور بڑی مخلص سہیلی نے اور جو اس کے باپ کے وزیر کی بیٹی تھی اور جس کا نام نجم النساء تھا جب اس کا یہ حال دیکھا تو بڑے غصے سے اسے مخاطب ہو کر کہنے لگی کہ "اے بدر منیر"

تو وہ ہے کہ سب کے تئیں دے وقوف — کدھر دل گیا ترا اے بے وقوف

تشریح: وزیر کی بیٹی نجم النساء نے شہزادی بدر منیر سے کہا کہ کبھی وہ دوسروں کو سمجھایا کرتی تھی، نصیحت کیا کرتی تھی کہ عشق و محبت کرنا نادانی اور حماقت کی بات ہے اور اب وہ خود بے وقوف بن گئی ہے، اب اس کا دماغ کام کیوں نہیں کر رہا۔

مسافر سے کوئی بھی کرتا ہے پیت　　　مثل ہے کہ جوگی ہوئے کس کے میت

تشریح: ظاہر ہے شہزادہ نجم النساء شہزادی بدر منیر کو سمجھاتی ہے کہ مسافر سے پیار نہیں کرنا چاہیے، اس کی مثال ایک جوگی کی سی ہوتی ہے اور مثل مشہور ہے کہ جوگی کبھی کسی کے دوست نہیں ہوتے۔ گویا اس نے شہزادے سے محبت کر کے غلطی کی ہے۔ اسے اس کا خیال دل سے نکال لینا چاہیے۔

اری چار دن کے ہیں یہ آشنا　　　ملا دل کو آخر کریں ہیں جدا

تشریح: نجم النساء بدر منیر کو سمجھاتی ہے کہ پردیسیوں کی محبت کا کوئی بھروسا نہیں ہوتا، ان کی مثال بھنوروں کی سی ہوتی، وقتی طور پر یہ دوستی اور محبت کا ڈھونگ رچاتے ہیں اور پھر ایک دن ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چلے جاتے ہیں۔ ان کی محبت پائیدار نہیں ہوتی لہٰذا ایسے لوگوں کی محبت کا خیال دل سے نکال دینا چاہیے۔

گہے آسمان گہ زمین کے ہیں یہ　　　جہاں بیٹھے جا بس وہیں کے ہیں یہ

تشریح: نجم النساء شہزادی کو سمجھانے کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہتی ہے کہ یہ پردیسی کبھی تو آسمان پر ہوتے ہیں اور کبھی زمین پر ان کا ٹھیک طرح سے پتہ نہیں ہوتا کہ کہاں ٹھہریں گے۔ یہ جہاں بیٹھ گئے، بیٹھ گئے اور جب جی چاہا اٹھ کر چلے گئے۔ اس لیے ان کی محبت کا اعتبار نہیں ہوتا۔

تو بھولی ہے جس بات پر اے بوا　　　خبر لے دوانی تجھے کیا ہوا

تشریح: نجم النساء شہزادی کو سمجھاتے ہوئے کہتی ہے کہ اے بہن تیری بھول ہے۔ اس شہزادے کا خیال دل سے نکال دے۔ ہوش کے ناخن لے، کیا تو پاگل ہو گئی ہے جو پردیسی کے انتظار میں بیٹھی آنسو بہا رہی ہے اور آہیں بھر رہی ہے۔

سنو جانی اپنے پہ کوئی مرے　　　تو دل پہلے اپنا بھی صدقے کرے

تشریح: وزیر زادی شہزادی کو سمجھاتی ہے کہ میری پیاری میری بات توجہ سے سنو اگر کوئی دل پر قبضہ جمانا چاہتا ہے تو پہلے وہ اپنا دل میرے حوالے کرے گا۔ دل لیے بغیر میں اپنا دل ہر گز ہر گز اس کے اختیار میں نہ دیتی۔

اگر آپ پر کوئی شیدا نہ ہو　　　تو پھر چاہیے اس کی پروانہ ہو

تشریح: نجم النساء شہزادی کو سمجھاتی ہے کہ اگر تم پر کوئی دل و جان سے عاشق نہ ہو، تم پر اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لیے تیار نہ ہو تو پھر تمہیں بھی ایسے مطلبی عاشق کی پروا نہیں کرنی چاہیے۔

وہ خوش ہو گا اپنی پری کو لیے　　　عبث اس پہ بیٹھی ہو تم جی دیئے

تشریح: نجم النساء شہزادی سے کہتی ہے کہ بے نظیر کی اس پری سے افہام و تفہیم ہو گئی ہو گی۔ جو اسے اغوا کر کے لائی تھی اور اب وہ اس پری کے ساتھ مزے کر رہا ہو گا۔ اور تو بے فائدہ اس کے انتظار میں جان ہلکان کر رہی ہے۔ وزیر زادی اسے سمجھا رہی ہے کہ اس بے وفا کا خیال دل سے نکال دے اور اس بے قراری کو ختم کر دے اور پہلے کی طرح آرام سے رہنے لگے۔

تمہاری اسے چاہ ہوتی اگر　　　تو اب تک وہ تم کو نہ آتا نظر

تشریح: نجم النساء شہزادی بدر منیر کو سمجھا رہی ہے کہ اگر بے نظیر کو اس سے دلی محبت ہوتی تو اتنے لمبا عرصہ تک غائب نہ رہتا، اور اگر کوئی مجبوری تھی تو بھی اسے اب تک ضرور نظر آنا چاہیے تھا۔

لگی کہنے تب اس کو بدر منیر　　　کہ سنتی ہے اب میری دختِ وزیر

تشریح: نجم النساء کی یہ جلی کٹی باتیں سن کر شہزادی بدر منیر کہنے لگی کہ اے وزیر زادی! اب میری بات بھی سنتی ہے یا نہیں؟

کسی کی بدی تو نہ کر عیب ہے　　　　　　کہ اس کا خدا عالم الغیب ہے

تشریح: شہزادی یہاں شہزادے کی وکالت میں اپنی سہیلی کو سمجھا رہی ہے کہ کسی کی برائی کرنا سب سے بڑا گناہ ہے۔ کیونکہ جس بات کے بارے میں معلوم نہ ہو اس کے بارے میں قیاس آرائیاں کرنا اچھی بات نہیں ہوتی اور غیب کا علم صرف اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔

وہ اپنے دلوں سے تو ہے نیک ذات　　　　　　ہوئی اس پہ کیا جانے کیا واردات

تشریح: شہزادے بے نظیر کا دفاع کرتے ہوئے بدر منیر کہنے لگی کہ میرا دل تو کہتا ہے کہ وہ اچھے خاندان سے تعلق رکھتا ہے اور اس کی نیت صاف ہے۔ نہیں معلوم اس کے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا ہے۔

ہوا قید یا آنے پایا نہ وہ　　　　　　گئے اتنے دن اب تک آیا نہ وہ

تشریح: شہزادی بدر منیر نے خدشہ ظاہر کیا کہ ممکن ہے پری نے اسے قید کر دیا ہو یا اس پر کوئی اور مصیبت ٹوٹ پڑی ہے جو اتنے دن گزر گئے اور وہ آ نہیں سکا۔ چونکہ اسے بے نظیر کی محبت پر پورا پورا بھروسا ہے اس لیے اس کے خلاف وہ کچھ بھی سننے کو تیار نہیں ہے۔

مجھے رات دن اس کا رہتا ہے ڈر　　　　　　پری نے سنی ہو نہ یاں کی خبر

تشریح: بدر منیر کہتی ہے کہ اسے ہر وقت اس بات کا ڈر لگا رہتا ہے کہ کہیں پری کو کسی نے بتا نہ دیا ہو کہ شہزادہ اس سے ملنے یہاں آتا ہے۔ ظاہر ہے اس صورت میں پری نے اسے بدر منیر کے پاس آنے سے روکنے کے لیے کوئی نہ کوئی قدم ضرور اٹھانا تھا۔

نہ باندھا ہو اس کو کسی صید میں　　　　　　کیا ہو نہ اس کے تئیں قید میں

تشریح: شہزادی بدر منیر وزیر زادی سے کہہ رہی ہے کسی نے اس طرح باندھ دیا ہو جیسے کسی شکار کو باندھتے ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کسی نے اسے قید کر لیا ہو۔ وہ شہزادے کے نہ آسکنے کے متعدد جواز پیش کر رہی ہے کیونکہ اس کا دل کہتا ہے کہ شہزادہ بے وفا نہیں۔

پرستان سے بھی نکالا نہ ہو　　　　　　کسی دیو کے منہ میں ڈالا نہ ہو

تشریح: بدر منیر یہ اندیشہ ظاہر کرتی ہے کہ ممکن ہے پری نے غصے میں آکر اسے پرستان سے نکال دیا ہو اور وہ کہیں جنگل میں ادھر اُدھر بھٹک رہا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ دیو نے اسے ہڑپ کر لیا ہو۔

یہ کہہ حال دل اپنا رونے لگی　　　　　　گہر آنسوؤں کے پرونے لگی

تشریح: اس طرح اپنے دل کا حال بیان کر کے بدر منیر رونے لگی اور آنسوؤں کے موتیوں کی لڑیاں پرونے لگی۔

گئی منڈ کری مار آخر کو لیٹ!　　　　　　چھپر کھٹ کے کونے میں سر منہ لپیٹ

تشریح: آخر بدر منیر ٹانگیں سمیٹ کر لیٹ گئی اور پلنگ کے ایک کونے میں منہ لپیٹ کر لیٹ گئی۔

مرثیہ

"مرثیہ" عربی کا لفظ ہے جو ایک اور لفظ "رثیٰ" سے مشتق ہے۔ رثیٰ کے معنی مُردے پر رونا اور آہ وزاری کرنا۔ مرثیوں کو ہم دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ (1) وہ مرثیے جو حضرت امام حسینؓ اور ان کے ساتھیوں کی شہادت اور کربلا کے دیگر واقعات پر مبنی ہیں۔ (2) وہ مرثیے جو مختلف مشاہیر قوم یا کسی عزیز کی موت پر لکھے جاتے ہیں۔ انھیں "شخصی مرثیے" کہتے ہیں۔

اردو میں شخصی مرثیے کہے گئے جیسے مولانا حالیؔ کا مرثیہ غالب ہے۔ ڈاکٹر اقبال نے "والدہ مرحومہ کی یاد میں" جو نظم کہی ہے وہ بھی بقول صالحہ عابد حسین اردو کے بہت عمدہ مرثیوں میں شمار کی جا سکتی ہے۔ اردو میں مرثیہ اس واقعہ سے مختص ہو گیا جس نے اسلامی دنیا میں تہلکا مچا دیا۔ یعنی جو حضرت امام حسینؓ کی شہادت اور اہل بیت کے مصائب سے متعلق ہے۔ ابتداء میں مرثیے کی کوئی خاص شکل متعین نہ تھی۔ شعراء کبھی غزل کی طرح متفرق اشعار میں اظہارِ غم کرتے تھے اور کبھی مثلث، مربع، مخمس، مسدس میں۔ یعنی ہر شکل میں مرثیے لکھے گئے مگر بعد میں مسدس رائج ہو گئی اور دوسری تمام ہیئتیں متروک ہو گئیں۔ مسدّس ہیئت کے مرثیے میں بند کے پہلے چار مصرعوں میں کسی بات کی تفصیل بیان کرتے ہیں اور آخری دو مصرعوں میں اس تفصیل کی بنا پر کوئی نتیجہ اخذ کر لیتے ہیں۔ کربلائی مرثیے کو درجِ ذیل عناصر میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

1۔ چہرہ: چہرہ دراصل مرثیہ کی تمہید ہے۔ اس میں صبح کا منظر، رات کا سماں، گرمی کی شدت، سفر کی دشواریاں، حمد و منقبت، تشخص ذاتی کے احساس اور تعلّی وغیرہ کے مضامین بیان کیے جاتے ہیں:

یارب چمن نظم کو گلزار ارم کر — اے ابر کرم خشک زراعت پہ کرم کر
توفیض کا مبدا ہے توجہ کوئی دم کر — گمنام کو اعجاز بیانوں میں رقم کر
جب تک یہ چمک مہر کے پرتو سے نہ جائے
اقلیم سخن میرے قلم رو سے نہ جائے (انیس)

2۔ سراپا: اس میں مرثیے کے ہیرو کے قد و قامت اور خد و خال بیان کیے جاتے ہیں۔ اس کی روحانی اور باطنی خوبیوں کے ساتھ شکل و صورت کا تذکر کیا جاتا ہے۔ حضرت عباس کا سراپا میر انیس کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

ماہِ بنی ہاشم تو زمانے میں لقب تھا — کیا حسن تھا کیا زور تھا کیا حسب و نسب تھا
انداز سراپا اسد اللہ کا سب تھا — الّا قد عباس کی مشہور عرب تھا
گر جلوہ نما ہوتے تھے وہ خانہءزیں پر
تو پاؤں لٹکتے ہوئے رہتے ہیں زمیں پر (انیس)

3۔ رخصت: حضرت امام حسینؓ کے خیمے سے جب کوئی بہادر میدانِ جنگ کی طرف کوچ کرتا ہے تو اہل خیمہ اسے بہ حسرت ویاس قوت ایمانی کے ساتھ رخصت کرتے ہیں۔ اس موقع پر مختلف نوعیت کے جذبات پر مبنی جو اشعار کہے جاتے ہیں انہیں رخصت کہا جاتا ہے۔ حضرت امام حسینؓ رخصت ہو رہے ہیں

جب پڑھ چکے شہ بعد فریضہ کی دعائیں — فرمایا کہ رخصت کے لیے بیبیاں آئیں
چھاتی سے پھر اک بار سکینہ کو لگائیں — کچھ بانو بھی کہہ لیویں تو سر دینے کو جائیں
بیووں سے ملاقات کی فرصت نہ ملے گی

پھر عصر تلک بات کی مہلت نہ ملے گی (انیس)

4۔ آمد: ہیرو کے میدان جنگ میں آمد اور ہیرو کے گھوڑے کی تعریف مرثیے کا ایک اور اہم جز ہے۔

کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے رن ایک طرف چرخِ کہن کانپ رہا ہے

رستم کا بدن زیرِ کفن کانپ رہا ہے ہر قصرِ سلاطینِ زمن کانپ رہا ہے

شمشیر بکف دیکھ کے حیدرؓ کے پسر کو

جبریل لرزتے ہیں سمیٹے ہوئے پر کو (دبیر)

5۔ رجز:۔ عرب میں رواج تھا کہ میدان جنگ میں جب حریف ایک دوسرے کے آمنے سامنے اور لڑائی کے لیے تیار ہوتے تو جنگ سے قبل ایک دوسرے کو للکارتے اور اپنی اپنی شجاعت، دلیری، قوت اور عظمت کا نہایت طاقت اور جوش سے اظہار کرتے تھے۔ شعر میں اس موقع کی تصویر کشی اور فریقین کے فخریہ اظہار کو "رجز" کہا جاتا ہے۔

دنیا ہو اک طرف تو لڑائی کو سر کروں آئے غضب خدا کا اُدھر، رُخ جدھر کروں

بے جبرئیل کارِ قضا و قدر کروں انگلی کے اک اشارے میں شق القمر کروں

طاقت اگر دکھاؤں رسالت مآب کی

رکھ دوں زمیں پہ چیر کے ڈھال آفتاب کی (انیس)

6۔ رزم: رجز کے بعد جنگ کا منظر آتا ہے۔ شجاعت، طاقت اور حرب و ضرب کے مضامین کو ڈرامائی انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔ مرثیہ کا سب سے اہم اور عظیم الشان عنصر رزمیہ ہے۔ اس میں جنگ کی تفصیل اور تمام جزئیات بیان کیے جاتے ہیں۔

اللہ رے زلزلہ کے لرزتے تھے دشت و در جنگل میں چھپتے پھرتے تھے ڈر ڈر کے جانور

جنات کانپ کانپ کے کہتے تھے الحذر دنیا میں خاک اڑتی ہے، اب جائیں ہم کدھر

اندھیر ہے، اٹھی بَرکت اب جہان سے

لو مل گیا زمیں کا طبق آسمان سے (انیس)

7۔ شہادت: جنگ کے منظر کی انتہا ہیرو کی شہادت پر ہوتی ہے۔ یہ وہ مقام ہے، مرثیے کا سامع جس کا شدت سے منتظر رہتا ہے اور اسے حاصل مجلس سمجھا جاتا ہے۔ شہادت کا بیان نہایت سادے پیرائے میں کیا جاتا ہے۔ حضرت امام حسین اپنے بیٹے کی حالت دیکھ کر فرماتے ہیں:

کیوں کھینچتے ہو پانو کو اے میرے گل عذار کیوں ہاتھ اٹھا اٹھا کے پٹکتے ہو بار بار

آنکھیں تو کھول دو کہ مرا دل ہے بے قرار بیٹا! تمہاری ماں کو تمہارا ہے انتظار

بہنیں کھڑی ہیں در پہ بڑے اشتیاق میں

اکبر! تمہاری ماں نہ جیے گی فراق میں

8۔ بین: ہیرو کی شہادت کے بعد اس پر بین اور اظہارِ تاسف کے ساتھ مرثیہ خاتمے پر پہنچتا ہے۔ عموماً مرثیے کا آخری حصہ ہوتا ہے اور رنج و الم کے جذبات کی عکاسی کے لحاظ سے نہایت پُر اثر ہوتا ہے۔ حضرت امام حسینؓ کی شہادت پر بی بی زینب یوں بین کرتی ہیں۔

بھیا مرا کوئی نہیں تو خوب ہو آگاہ احمدؐ ہیں نہ زہراؓ نہ حسنؓ ہیں نہ یداللہؓ

ڈھارس تھی بڑی آپ کی، اے سید ذی جاہ چھوڑا مجھے جنگل میں یہ کیا قہر کیا آہ

چلتے ہوئے کچھ مجھ سے نہ فرما گئے بھائی
بہنا کو نجف تک بھی نہ پہونچا گئے بھائی

9۔ دعا: خاتمہ کلام پر شاعر دعا کرتا ہے۔ اپنے مرثیے کو شفاعت اور بخشش کا ذریعہ بننے کی دعا کرتا ہے۔ کبھی مرثیہ گو اپنی جماعت کے فلاح و بہبود کے لیے دعا کرتا ہے:

خامے کو بس اب روک انیسؔ جگر افگار	خالق سے دعا مانگ کے اے ایزد غفار
زندہ رہیں دنیا میں شہ دیں کے عزادار	غیر از غم شہ، ان کو نہ غم ہو کوئی زنہار

آنکھوں سے مزار شہ دلگیر کو دیکھیں
اس سال میں بس روضۂ شبیرؑ کو دیکھیں

ارتقاء:

فارسی اور عربی کی بجائے اردو مرثیے کا سانچا خاص اردو زبان سے آیا ہے۔ بقول ڈاکٹر سید حامد حسین اردو مرثیہ کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی اردو زبان کی تاریخ۔ سارے دکنی شعراء جیسے وجہیؔ، غواصیؔ، نصرتیؔ، محمد قلی قطب شاہ نے مرثیے لکھے۔ دکنی دور کے مرثیے اردو شاعری کا اولین نمونہ بھی ہیں۔

شمالی ہند میں مرثیہ گوئی کا آغاز اٹھارویں صدی کی ابتدا میں ہوتا ہے۔ ولیؔ کا دیوان دلی پہنچا۔ شمالی ہند میں دکنی مرثیے کی آمد شروع ہو گئی۔ سودا نے گو مربع میں مراثی کہے لیکن مسدس کی شکل میں سب سے پہلے سودا ہی نے مرثیے کہے۔ رفتہ رفتہ مسدس ہی مرثیہ کی مقبول شکل بن گئی۔ شاہانِ اودھ چونکہ شیعہ عقیدہ رکھتے تھے اس لیے اس زمانے میں مرثیہ گوئی کو فروغ حاصل ہوا۔ خلیقؔ، ضمیرؔ، انیسؔ اور دبیرؔ نے مرثیہ میں درد کے اثر کو درجہ کمال تک پہنچا دیا۔ مرثیہ کا موضوع مجموعی طور پر ایک ہی تھا یعنی سانحہ کربلا۔ بار بار ایک ہی واقعہ کو دہرانا پڑتا تھا اس لیے مرثیہ نگار وسعت دینے کے لیے اس واقعہ کو مختلف زاویوں سے پیش کرنے لگے۔ چنانچہ امام حسینؑ کی مدینہ سے روانگی، مسلم بن عقیل اور ان کے بچوں کی کوفے میں شہادت، کربلا میں آمد، پھر شہادت، سفر شام، قید خانے کی صعوبتیں پھر مدینہ کی واپسی تک کے واقعات پر الگ الگ مرثیے لکھے گئے۔ کربلا میں حضرت قاسم، علی اکبر، علی اصغر، عباس علمدار، عون و محمد پر الگ الگ مراثی لکھے جانے لگے۔ ساتھ ہی امام حسین کے ساتھیوں، حُر، حبیب ابن مظاہر اور زہیر ابن قیس کو بھی مرثیوں میں جگہ دی گئی۔ لکھنؤ کے زوال کے بعد وہ فضا جو مرثیہ کی خاص فضا تھا مٹ گئی۔ وہ ماحول نہ رہا جس میں مرثیہ نے ترقی کی۔ مرثیوں کا قدیم رنگ انیس، دبیر اور ان کے خاندان کے افراد کے ساتھ ختم ہو گیا لیکن مرثیہ بحیثیت صنف ختم نہ ہوا۔ مرثیے کا سفر ان کے بعد بھی جاری رہا۔ جوش، نجم آفندی، نسیم امروہی، جمیل مظہری، آل رجا، ڈاکٹر صفدر حسین اور آغا سکندری مہدی اور وحید اختر اس سلسلے کے نمایاں نام ہیں۔

میر انیس

وفات:29شوال1291ھ مطابق10دسمبر1874ء

میر مستحسن خلیق کے صاحبزادے تھے اور معروف مثنوی سحر البیان کے خالق میر غلام حسین حسن ان کے دادا تھے۔1803ء کو فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ خاندانِ سادات سے تعلق تھا۔ مولوی حیدر علی اور مفتی حیدر عباس سے عربی، فارسی پڑھی۔ فنون سپہ گری کی تعلیم بھی حاصل کی۔ فن شہسواری سے بخوبی واقف تھے۔ شعر میں اپنے والد سے اصلاح لیتے تھے۔ پہلے حزیں تخلص تھا۔ شیخ امام بخش ناسخ کے کہنے پر انیس اختیار کیا۔ ابتدا میں غزل کہتے تھے۔ مگر والد کی نصیحت پر مرثیہ کہنے لگے اور پھر کبھی غزل کی طرف توجہ نہیں کی۔

اس خاندان میں شاعری کئی پشتوں سے چلی آتی تھی۔ آپ کے مورثِ اعلیٰ میر امامی شاہ جہان کے عہد میں ایران سے ہند میں آئے تھے اور اپنے علم و فضل کی بنا پر اعلیٰ منصب پر متمکن تھے۔ ان کی زبان فارسی تھی لیکن ہندوستانی اثرات کے سبب دو نسلوں کے بعد ان کی اولاد فصیح اردو زبان بولنے لگی۔ میر انیس کے پردادا اور میر حسن کے والد میر غلام حسین ضاحک اردو کے صاحب دیوان اور غزل گو شاعر تھے۔

عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں
پانچویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں

میر ببر علی انیس کو دشت کربلا کا عظیم ترین سیّاح قرار دیا گیا ہے۔ اُن کے مرثیوں کی تعداد بارہ سو(1200) کے لگ بھگ بیان کی جاتی ہے۔ انیس نے مرثیے کو ترقی کے اعلیٰ درجے پر پہنچایا۔ اردو میں رزمیہ شاعری کی کمی پوری کی۔ انسانی جذبات و مناظر قدرت کی مصوری کے ذریعے زبان میں وسعت نکالی۔ سلام اور رباعیوں کا شمار نہیں۔ مرثیوں کی پانچ جلدیں طبع ہو چکی ہیں۔

انیس کا فن

تعریف میں چشمے کو سمندر سے ملا دوں   قطرے کو جو دوں آب تو گوہر سے ملا دوں
ذرے کی چمک مہر منور سے ملا دوں   کانٹوں کو نزاکت میں گلِ تر سے ملا دوں
گلدستہ معنی کو نئے ڈھنگ سے باندھوں
اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں

مراثی انیس کے اجزائے ترکیبی:۔

چہرہ:۔ چہرہ مرثیہ کا پہلا جزو ہوتا ہے اس کی حیثیت تقریباً ایسی ہی ہے جیسے قصیدے میں تشبیب کی ہوتی ہے چہرہ سے مرثیہ گو اپنے مرثیہ کا آغاز کرتا ہے یہ آغاز مختلف نوعیت کا ہو سکتا ہے۔ مثلاً انیس نے مراثی انیس جلد اوّل میں اپنے پہلے مرثیے کا آغاز دعا سے کیا ہے انہوں نے خدا سے دعا کی ہے کہ ان میں وہ شعر گوئی کی صلاحیت پیدا کر دے چنانچہ وہ کہتے ہیں۔

یارب! چمن نظم کو گلزارِ ارم کر   اے ابر کرم! خشک زراعت پہ کرم کر
تو فیض کا مبدا ہے توجہ کوئی دم کر   گمنام کو اعجاز بیانوں میں رقم کر
جب تک یہ چمک مہر کے پر تو سے نہ جائے
اقلیم سخن میرے قلم رو سے نہ جائے

میر انیس نے چہرے میں کبھی کبھی اخلاقی قدروں کو پیش کیا ہے۔ ان اخلاقی قدروں کی وجہ سے مرثیے کی عظمت میں اضافہ ہو گیا ہے۔

سراپا:۔ مرثیے کا دوسرا جزو سراپا ہوتا ہے جس میں کرداروں کے جسم، قدو قامت اور خط و خال کا نقشہ کھینچا جاتا ہے میر انیس نے جابجا مختلف کرداروں کا سراپا پیش کیا ہے۔ حضرت امام حسینؑ کے بھائی کے حسن اور قد کاٹھ کے بارے میں میر انیس فرماتے ہیں،

ماہِ بنی ہاشم تو زمانے میں لقب تھا | کیا حسن تھا کیا زور تھا کیا حسب و نسب تھا
انداز سراپا اسد اللہ کا سب تھا | الّا قد عباس کا مشہور عرب تھا
گر جلوہ نما ہوتے تھے وہ خانہ ءزیں پر
تو پاؤں لٹکتے ہوئے رہتے ہیں زمیں پر (انیس)

رخصت:۔ مرثیہ کا تیسرا جزو رخصت ہے جب کوئی جنگ کے لئے جاتا تھا تو اہل بیت اس کو رخصت کرتے تھے جس کا ذکر ذیل کی سطور میں کیا جا رہا ہے۔ جناب عون و جناب محمد حضرت زینب کے بیٹے ہیں۔ اگرچہ کم سن ہیں لیکن شجاعت ان کی سرشت میں داخل ہے ان کی رخصت کا منظر میر انیس یوں بیان کرتے ہیں۔

خیمے سے برآمد ہوئے زینب کے جو دلبر | دیکھا کہ حسین ابن علی روتے ہیں در پر
بس جھک گئے تسلیم کو حضرت کی، وہ صفدر | منہ کرکے سوئے چرخ پکارے شہ بے پر
یہ وہ ہیں جو آغوش میں زینب کے پلے ہیں
بچے بھی تیری راہ میں مرنے کو چلے ہیں

آمد:۔ آمد کو ہم مرثیہ کا چوتھا جزو تصور کر سکتے ہیں اس میں مرثیہ گو کردار کی آمد پیش کرتا ہے اور اس کی شان و شوکت پر روشنی ڈالتا ہے میر انیس نے اپنے مرثیوں میں مختلف کرداروں کی آمد دکھائی ہے۔ حسینی لشکر میں سب سے زیادہ بہادر حضرت عباس تھے اس کا سبب یہ ہے کہ ان کا عہد شباب تھا اس لئے ان کے بازوؤں میں بچوں بوڑھوں سے زیادہ طاقت تھی اسی بناء پر ان کی آمد مندرجہ ذیل بندوں میں پیش کرتے ہیں،

آمد ہے کربلا کے نیستاں میں شیر کی | ڈیوڑھی سے چل چکی ہے سواری دلیر کی
جاسوس کہہ رہے ہیں نہیں راہ پھیر کی | غش آگیا ہے شہ کو یہ ہے وجہ دیر کی
خوشبو ہے دشت، بادِ بہاری قریب ہے
ہشیار غافلو کہ سواری قریب ہے

رجز:۔ مرثیہ کا پانچواں جزو رجز ہے جب کردار میدان جنگ میں آتا ہے تو وہ اپنے آباواجداد کی شجاعت کا بیان کرتا ہے۔ اور پھر اپنی بہادری کا قصہ اعدا کے دل میں بٹھاتا ہے۔ میر انیس نے مختلف کرداروں کے رجز کا ذکر کیا ہے جس کی وضاحت مندرجہ ذیل سطور میں کی جاتی ہے۔ حضرت امام حسین رجز خوانی میں ماہر تھے چونکہ وہ بہت اعلیٰ مرتبے کے حامل تھے اس لئے ان کی رجز خوانی میں بہت اثر تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس میں صداقت بھی تھی میر انیس نے ان کی رجز خوانی پر روشنی ڈالی ہے۔

دنیا ہو اک طرف تو لڑائی کو سر کروں | آئے غضب خدا کا اُدھر، رُخ جدھر کروں
بے جبرئیل کارِ قضا و قدر کروں | انگلی کے اک اشارے میں شق القمر کروں
طاقت اگر دکھاؤں رسالت مآب کی
رکھ دوں زمیں پہ چیر کے ڈھال آفتاب کی (انیس)

رزم:۔ مرثیے کا چھٹا جزو جنگ کو قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس میں کربلا کی جنگ کا نقشہ کھینچا جاتا ہے۔ میر انیس نے عون و محمد کی جنگ کا نقشہ یوں کھینچا ہے۔

اللہ رے زلزلہ کے لرزتے تھے دشت و در — جنگل میں چھپتے پھرتے تھے ڈر ڈر کے جانور
جنات کانپ کانپ کے کہتے تھے الحذر — دنیا میں خاک اڑتی ہے، اب جائیں ہم کدھر
اندھیر ہے، اٹھی بَرَکت اب جہان سے
لو مل گیا زمیں کا طبق آسمان سے (انیس)

شہادت:۔ مرثیے کا ساتواں جزو شہادت ہے دراصل شہادت کا سلسلہ میدانِ کربلا سے قبل ہی شروع ہو جاتا ہے۔ جب اہل کوفہ نے حضرت امام حسین کو اپنے وطن میں بیعت کے لئے بلایا تو انہوں نے اپنے چچا کے بیٹے مسلم بن عقیل کو کوفہ روانہ کیا۔ وہاں اہلِ کوفہ نے ان کے ساتھ دغا کی اور ان کو شہید کر دیا۔ یہ منظر دیکھئے،

جب کوفیوں نے کوفہ میں مسلم سے دغا کی — جو عہد کیا ایک نے اس پر نہ وفا کی
کی شرم خدا سے نہ محمد سے حیاء کی — مظلوم پہ، بے کس پہ، مسافر پہ جفا کی
پانی نہ دمِ مرگ دیا تشنہ دہن کو
کس ظلم سے ٹکڑے کیا آوارہ وطن کو

بین:۔ بین کو ہم مرثیے کا آٹھواں جزو تصور کر سکتے ہیں اس حصہ میں شہدائے کربلا پر اہل بیت ماتم کرتے ہیں عورتیں سر کے بال کھول کر فریاد و فغاں کرتی ہیں اور مرد بھی رنج و غم کا اظہار کرتے ہیں مگر بین کا خاص طور سے تعلق مستورات کی گریہ وزاری سے ہے میر انیس نے بین کے حصے کو بہت موثر انداز میں پیش کیا ہے۔

حضرت علی اکبر سب کو عزیز تھے اس کے علاوہ وہ بہت بہادر بھی تھے ان کی شادی کا شوق حضرت بانو اور حضرت زینب کو بہت تھا یہ ارمان بھی اُن کا نہ نکل سکا اس لئے ان کی شہادت کا غم سب کو ہوا۔ اس بین کا ذکر میر انیس نے نہایت موثر انداز میں اس طرح کیا ہے۔

آواز پسر سنتے ہی حالت ہوئی تغیر — چلا کے کہا ہائے کلیجے پہ لگا تیر
برچھی سے تو زخمی ہوئے واں اکبر دل گیر — بسمل سے تڑپنے لگے یاں حضرت شبیر
تھا کون اُٹھاتا جو زمیں سے انہیں آکر
اُٹھ کر کبھی دوڑے تو گرے ٹھوکریں کھا کر

میر انیس کے مرثیہ کی خصوصیات۔

میر انیس کے مرثیہ کی خصوصیات مندرجہ ذیل ہیں،

جذبات نگاری:۔

انیس کی وہ سب سے بڑی امتیازی خصوصیت جو ان کو اور تمام شعراء سے ممتاز کرتی ہے۔ جذبات نگاری ہے۔ میر انیس کے یہاں جذبات نگاری کے ایسے ایسے نمونے ملتے ہیں جن کی مثال اردو میں تو کیا دوسری زبانوں میں بھی ملنا دشوار ہے۔

مثلاً جب قافلہ مدینہ سے روانہ ہو رہا ہے۔ حضرت صغریٰ سب سے مل رہی ہیں اور بیماری کی وجہ سے ساتھ نہیں جاسکتی۔ اس وقت کی کیفیات کی اس سے زیادہ درد انگیز اس سے زیادہ صحیح تصویر اور کیا ہو سکتی ہے جس کو میر انیس نے یہاں بیان کیا ہے۔

ماں بولی یہ کیا کہتی ہے صغریٰ ترے قرباں　　گھبرا کے نہ اب تن سے نکل جائے مری جاں
بے کس میری بچی تری اللہ نگہباں　　صحت ہو تجھے میری دعا ہے یہی ہر آں
کیا بھائی جدا بہنوں سے ہوتے نہیں بیٹا
کنبے کے لئے جانوں کو کھوتے نہیں بیٹا

منظر کشی:۔

الفاظ میں کسی جذبہ، واقعہ یا منظر کھینچنا محاکات کہلاتا ہے۔ محاکات کی قدرت انیس میں اس درجہ بڑھی ہوئی تھی کہ خود مرزا دبیر کے مداحوں کو میر انیس کی عظمت کو تسلیم کرنا پڑا ہے۔ یہ خصوصیت ان کو (میر حسن مثنوی سحر البیان) سے ترکہ میں ملی تھی۔ میر انیس کا کمال یہ ہے کہ جس واقعہ کو بیان کرتے ہیں اس کی تصویر کھینچ دیتے ہیں بلکہ ان کی تصویر کبھی کبھی اصل سے بھی بہتر ہو جاتی ہے۔ اس سلسلے میں ایک بہت خوبصورت مثال پیش کی جاتی ہیں۔ مثلاً اس جگہ صبح کا سماں کا کتنا اچھا نقشہ کھینچا گیا ہے۔

چلنا وہ باد صبح کے جھونکوں کا دمبدم　　مرغانِ باغ کی وہ خوش الحانیاں بہم
وہ آب و تاب نہر وہ موجوں کا پیچ و خم　　سردی ہوا میں پر نہ زیادہ بہت نہ کم
کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا

واقعہ نگاری:۔

میر انیس واقعہ نگاری کے مرد میدان ہیں۔ بقول شبلی نعمانی

"میر انیس نے واقعہ نگاری کو جس کمال کے درجہ تک پہنچایا اُردو کیا فارسی میں بھی اس کی نظیریں مشکل سے ملتی ہیں۔"

میر انیس کی نگاہوں سے دقیق اور چھوٹے سے چھوٹا نکتہ بھی نہیں بچتا۔ مثلاً ایک موقعے پر گھوڑے کی تیز روی کو لکھا ہے جب حد سے زیادہ تیز دوڑتا ہے تو اُس کی دونوں کنوتیاں کھڑی ہوں کر مل جاتی ہیں۔ جب رفقائے امام نماز سے لڑائی کے لئے اُٹھے اس موقعہ پر لکھتے ہیں۔

تیار جان دینے پہ چھوٹے بڑے ہوئے　　تلواریں ٹیک ٹیک کے سب اُٹھ کھڑے ہوئے

کردار نگاری:۔

ڈرامہ کی طرح مرثیہ میں بھی کردار نگاری کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ مرثیے کے کردار مثالی ہوتے ہیں۔ جیسے امام حسین اور ان کے ساتھی حق و صداقت کے علم بردار اور یزیدی لشکر باطل کا پیروکار۔ انیس کے کردار زندہ اور متحرک ہوتے ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے مرثیہ کا کردار سامع کا قریبی آدمی ہے۔ میر انیس کردار سیرت، عمر اور مرتبے میں بڑی رعایت رکھتے ہیں یہی وہ خوبی ہے جن کی داد ان کے لکھنوی سامعین یہ کہہ دیتے ہیں کہ میر صاحب "فرق مراتب کا لحاظ رکھتے ہیں۔" کردار نگاری انیس پر ختم ہے یہ مصرع دیکھئے کس قدر زور دار ہے اور کردار کا نقشہ کس قدر مکمل ہے۔

نکلا ڈکارتا ہوا ضیغم کچھار سے

اخلاقی شاعری:۔

انیس نے تمام کلام میں بلند اخلاقی لہر دوڑائی ہوئی ہے۔ جن اخلاقِ فاضلہ کی تعلیم انیس نے دی ہے وہ کسی اور جگہ نہیں ملتی۔ انہوں نے نفسِ انسانی کے انتہائی شرافت کے نقشے جن موثر طریقوں سے کھینچے ہیں ان کا جواب ممکن نہیں۔ یوم عاشورہ جب امام حسین میدان کارزار میں جامے کے لئے رخصت ہونے لگتے ہیں تو سب کو صبر کی تلقین کرتے ہوئے کہتے ہیں،

جس وقت مجھے ذبح کرے فرقہ ناری　　رونا نہ سنے کوئی نہ آواز تمہاری
بے صبروں کا شیوہ ہے بہت گریہ وزاری　　جو کرتے صبر ان کا خدا کرتا ہے یاری
ہوں لاکھ ستم، رکھیو نظر اپنی خدا پر
اس ظلم کا انصاف ہے اب روز جزا پر

فصاحت وبلاغت:۔

میر انیس کے کلام کی ایک بڑی خصوصیت ان کی فصاحت وبلاغت ہے میر انیس نے اردو شعراء میں سب سے زیادہ الفاظ استعمال کئے ہیں۔ مگر ان کے ہاں غیر فصیح الفاظ کا ملنا مشکل ہے اور یہی وہ خصوصیت ہے جو ان کو تمام دوسرے مرثیہ گو شعراء سے اور خود مرزا دبیر سے بھی یقیناً ممتاز اور نمایاں کرتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ بیان کا حسن اور طرزِ ادا کی خوبی اس درجہ موجود ہے کہ وہ اردو ادب میں آج بھی اپنا حریف تلاش کر رہی ہے۔ خود وہ حضرات بھی جو مرزا دبیر کے کلام کے مداح ہیں اس بات کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ انیس کے یہاں دبیر سے زیادہ فصاحت وبلاغت اور حسنِ بیان موجود ہے۔ ان خصوصیات کی مثال ان کا پورا کلام ہے اس لئے اشعار پیش کرنا تحصیل حاصل ہے۔ مثلاً ملاحظہ ہوں،

دولھا سے پہلے مجھ کو اُٹھالے تو خوب ہے　　عورت کی موت خوب ہے شوہر کے سامنے
سایہ کسی جگہ ہے نہ چشمہ نہ آب ہے　　تم تو ہوا میں ہو، مری حالت خراب ہے
پیاسی جو تھی سپاہ خدا تین رات کی
ساحل سے سر پٹکتی تھیں موجیں فرات کی

تشبیہات واستعارات:۔

میر انیس نے تشبیہات اور استعارات کے نہایت دلکش نقش ونگار بنائے ہیں اور ان میں عجب خوشنما رنگ بھرے ہیں۔ مثلاً

پانی نہ تھا وضو جو کریں وہ فلک مآب　　پر تھی رخوں پہ خاک تیمم سے طرفہ آب
باریک ابر میں نظر آتے تھے آفتاب　　ہوتے ہیں خاکسار غلام ابوتراب

تشبیہ کی خوبیاں جس قدر میر انیس کے کلام میں پائی جاتی ہیں اُردو زبان میں اور کہیں نہیں مل سکتی۔ مثلاً جب حضرت عباس پر چاروں طرف سے برچھیاں چلنے لگیں تو یہ حالت اس طرح ظاہر کی۔

یوں برچھیاں تھیں چاروں طرف اس جناب کے　　جیسے کرن نکلتی ہے گرد آفتاب کے

روزمرہ محاورہ:۔

انیس کو خود اپنے روزمرہ و محاورہ پر ناز تھا۔ اور بجا طور پر ناز تھا۔ دراصل روزمرہ محاورہ اصل میں ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ لیکن بعض اہل تحقیق زبان دانوں نے ان میں فرق قرار دیا ہے اور وہ یہ کہ ایک سے زیادہ لفظ یا ترکیبیں حقیقی معنوں میں جس طرح اہل زبان استعمال کرتے ہیں ان کو روزمرہ اور مجازی معنوں میں مستعمل ہونا محاورہ کہلاتا ہے۔ مثلاً

آگے تھے سب کے حضرت عباس ذی حشم   بڑھ بڑھ کے روکتے تھے دلیروں کو دمبدم

تیغیں جو تولتے تھے، ادھر بانی ستم   کہتے تھے سر نہ ہوگا بڑھایا اگر قدم

میر انیس کے ان اشعار میں "بڑھ بڑھ کے" اور "سر نہ ہوگا" روزمرہ ہے اور "تیغیں تولتے تھے" محاورہ ہے۔

مجموعی جائزہ:۔

میر انیس کے ہاں مرثیوں میں قصیدے کی شان و شوکت، غزل کا تغزل، مثنوی کا تسلسل، واقعہ اور منظر نگاری اور رباعی کی بلاغت سب کچھ موجود ہے۔

بقول رام بابو سکسینہ،

"ادب اردو میں انیس ایک خاص مرتبہ رکھتے ہیں بحیثیت شاعر کے ان کی جگہ صف اولین میں ہے اور بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو ان کو زبان اردو کے تمام شعراء سے بہترین اور کامل ترین سمجھتے ہیں اور ان کو ہندوستان کا شکسپیر اور خدائے سخن اور نظم اردو کا ہومر اور ورجل اور بالمیک خیال کرتے ہیں۔"

تشریح

شعباں کی ہے تاریخ سویم روزِ ولادت　　　اور ہے دہم ماہِ عزا یومِ شہادت
دونوں میں بہر حال ہے تحصیلِ سعادت　　　وہ بھی عمل خیر ہے یہ بھی ہے عبادت
مدّاح ہوں کیا کچھ نہیں اس گھر سے ملا ہے
کوثر ہے صلا اس کا بہشت اس کا صلا ہے

تشریح: میر انیس لکھتے ہیں کہ حضرت امام حسینؓ شعبان کی تین تاریخ کو پیدا ہوئے اور ماتم کے مہینے یعنی محرم الحرام کی دس تاریخ ان کی شہادت کا دن ہے۔ بہر حال دونوں دن ہی نیک بختی حاصل کرنے کے دن ہیں۔ وہ بھی نیک عمل ہے اور یہ بھی عبادت ہے۔ میں اس گھرانے کی تعریف کے گن گانے والا ہوں۔ اس گھر سے مجھے کیا کچھ نہیں ملا؟ مراد یہ ہے کہ آل رسولؐ نے مجھے بہت کچھ دیا ہے۔ اہلِ بیت کی مدح سرائی کا انعام مجھے حوض کوثر کی صورت میں ملا ہے۔ چنانچہ اس مداحی کے بدلے حوض کوثر کا پانی پینے کو میسر آجائے گا اور رسول کے گھرانے کی مداح سرائی کا دوسرا انعام بہشت کی صورت میں ملے گا۔ بہشت ایک ایسی لاجواب جگہ ہوگی جہاں ہر قسم کی سہولتیں اور عیش و آرام ہوگا۔ کوئی شخص بھی ان دو چیزوں سے بڑھ کر کسی اور چیز کی تمنا نہیں کرتا۔

مقبول ہوئی عرض، گنہ عفو ہوئے سب　　　امید بر آئی، مراحاصل ہو مطلب
شامل ہوا افضالِ محمدؐ کرمِ رب　　　ہوتے ہیں علم فوجِ مضامین کے نشاں اب
پستی پہ ہیں سب رکنِ رکین دینِ متیں کے
ڈنکے سے ہلا دیتا ہے طبقوں کو زمیں کے

تشریح: انسان سے چھوٹے بڑے گناہ سرزد ہوتے ہی رہتے ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ میں نے اللہ تبارک و تعالیٰ سے گناہوں کی بخشش کی دعا کی تھی۔ میری دعا رب العزت کی بارگاہ میں قبول ہوئی اور میرے سارے گناہ معاف ہو گئے۔ میری امید پوری ہو گئی اور میرا گوہر مقصود میرے ہاتھ لگ گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اب خیالات کے لشکر کے جھنڈے بلند ہونے لگے ہیں یعنی خیالات کا ہجوم ہونے لگا ہے، خیالت امڈے چلے آرہے ہیں۔ مضبوط اور سنجیدہ دین یعنی اسلام کے سب سے مضبوط رکن میری تائید اور حمایت کر رہے ہیں۔ میں اس زور کا نقارہ بجاتا ہوں کہ زمین کے ساتوں طبق ہلا دیتا ہوں۔ مراد یہ ہے کہ میری آواز دنیا کے کونے کونے میں پہنچ رہی ہے۔

نازاں ہوں عنایت پہ شہنشاہِ زمن کی　　　بخشی ہے رضا جائزہ فوجِ سخن کی
چہرے کی بحالی سے قبا چست ہے تن کی　　　لو بر طرفی پڑ گئی مضمون کہن کی
اِک فرد پرانی نہیں دفتر میں ہمارے
بھرتی ہے نئی فوج کی لشکر میں ہمارے

تشریح: میر انیس کہتے ہیں کہ مجھے اس بات پر بڑا فخر ہے کہ زمانے کے شہنشاہ یعنی حضرت امام حسینؓ کی مجھ پر خاص عنایت ہے۔ انہوں نے منظوری دی ہے کہ میں خیالات کے لشکر کا جائزہ لوں۔ قاعدہ ہے کہ لشکر کا سربراہ اپنے لشکر کا جائزہ لیتا ہے اور اسے سلامی دیتا ہے۔ میر صاحب کہتے ہیں کہ ان کے ذہن میں طرح طرح کے خیالات آرہے ہیں۔ اب میں ان میں نہایت موزوں اور نہایت خوبصورت خیالات چن کر اپنے شعروں کی تخلیق کے لیے استعمال کروں گا اور ان کی شان و شوکت دکھاؤں گا۔ چونکہ وہ امام حسینؓ نے اپنی حفاظت میں لے لیا ہے اس لیے میرے بدن کی قبا چست ہے۔ دیکھو پرانے خیالات کو ذہن سے بالکل نکال دیا ہے اور اظہار خیال کے لیے تازہ اور نئے خیالات سے کام لیا جا رہا ہے۔ میر صاحب پھر کہتے ہیں ہمارے رجسٹر میں ایک فہرست بھی پرانی نہیں، ہم

نے اپنے خیالات کے لشکر میں سبھی نئے نئے خیالات شامل کیے ہیں۔ میر انیس کے کلام کی یہ نمایاں خصوصیت بھی ہے اوراس پر انہیں بڑا فخر بھی تھا کہ وہ اپنے اشعار میں نئے نئے خیالات پیش کرتے ہیں۔

ہاں اے فلکِ پیر نئے سر سے جواں ہو　　　اے ماہِ شبِ چار دہم نور فشاں ہو
اے ظلمتِ غم دیدۂ عالم سے نہاں ہو　　　اے روشنیٔ صبح شبِ عید عیاں ہو
شادی ہے ولادت کی ید اللہ کے گھر میں
خورشید اترتا ہے شہنشاہ کے گھر میں

تشریح: شعری روایت ہے کہ آسمان کو بوڑھا کہتے ہیں کیونکہ انسان کے اس دنیا میں آنے سے پہلے یہ موجود تھا۔ ید اللہ کے لفظی معنی ہیں خدا کا ہاتھ اور کنایۃً حضرت علیؓ مراد ہیں۔ چونکہ یہ حضرت امام حسینؓ کی پیدائش کا دن ہے۔ اس لیے حضرت علیؓ کے گھر میں بہت خوشی منائی جارہی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے کسی بادشاہ کے گھر میں چاند اتر آیا ہو۔ اسی خوشی کے موقع کی مناسبت سے آسمان سے مخاطب ہو کر میر انیس کہتے ہیں کہ اے بوڑھے آسمان! یہ خوشی کی خبر سن کر تو بھی نئے سرے سے جوان ہو جا۔ میر صاحب کے سامنے زلیخا کی مثال موجود تھی جو بہت بوڑھی ہو چکی تھی لیکن یوسف علیہ سلام کی دعا اور ان سے شادی کی خوشی سے وہ دوبارہ جوان ہو گئی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان کے بدن میں قسم قسم کے غدود ہوتے ہیں۔ کچھ غم کی حالت میں اور کچھ خوشی کی حالت میں متحرک ہو جاتے ہیں اورانسانی صحت پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ پھر چودھویں رات کے چاند سے کہتا ہے کہ اے چودھویں رات کے چاند تو اپنی روشنی بکھیر۔ اے غم کے اندھیرے تو دنیاوالوں کی آنکھوں سے پوشیدہ ہو جا۔ مراد یہ ہے کہ ایسا خوشی کا موقع ہے کہ غم کا تصور بھی نہیں ہونا چاہیے۔ اے صبح کی روشنی! خدا کرے عید کی شام نمودار ہو۔ چاند رات کو لوگ بہت خوش ہوتے ہیں اور عید کی خوشیوں کی تیاریوں میں لگ جاتے ہیں۔ اسی لیے چاند رات کی آمد کی تمنا کی جارہی ہے۔

اے شمس و قمر، اور قمر ہوتا ہے پیدا　　　نخلِ چمنِ دیں کا ثمر ہوتا ہے پیدا
مخدومۂ عالم کا پسر، ہوتا ہے پیدا　　　جو عرش کی ضَو ہے، وہ گہر ہوتا ہے پیدا
ہر جسم میں جاں آتی ہے مذکور سے جس کے
نو نورِ خدا ہوں گے عیاں، نور سے جس کے

تشریح: سورج چاند سے مخاطب ہو کر میر انیس کہتے ہیں کہ اے سورج اور چاند ایک اور چاند پیدا ہو رہا ہے ظاہر ہے کہ جس طرح سورج اور چاند روشنی بکھیرتے ہیں اسی طرح امام حسینؓ کی تشریف آوری ہے دنیا میں اجالا ہو، اس لیے انہیں چاند کہا گیا ہے۔ دین کے چمن کے درخت کو پھل لگ رہا ہے۔ بلاشبہ میدانِ کربلا میں امام حسین نے شہادت پا کر اپنے خون سے دین کے نخل کی آبیاری کی۔ ان کی ان عدیم المثال قربانی سے دین کی بنیادیں مستحکم ہوئیں۔

حضرت فاطمہؓ جو ساری دنیا کی عورتوں کی سردار ہیں ان کے ہاں بیٹا پیدا ہو رہا ہے۔ وہ موتی پیدا ہو رہا ہے جس کی وجہ سے عرشِ معلی کی چمک دمک ہے۔ امامؓ کو استعارہ کے طور پر موتی کہا گیا ہے۔ وہ ہستی دنیا میں تشریف لا رہی ہے جس کے ذکر سے جسم میں زندگی کی نئی لہر دوڑ جاتی ہے۔ ان کے نور سے خدا کے نو اور نور پیدا ہوں گے۔ یعنی ان کی نسل سے نو امام پیدا ہوں گے۔ پہلے امام حضرت علیؓ دوسرے حضرت حسنؓ اور تیسرے حضرت حسینؓ تھے۔ ان کے بعد یہ باقی امام پیدا ہوئے۔ حضرت زین العابدینؓ، امام محمد باقرؒ اور امام جعفر صادقؒ وغیرہ۔

اے کعبہ ایماں تری حرمت کے دن آئے　　　اے رکنِ یمانی، تری شوکت کے دن آئے
اے بیتِ مقدس، تری عزت کے دن آئے　　　اے چشمۂ زمزم، تری چاہت کے دن آئے
اے سنگِ حرم، جلوہ نمائی ہوئی تجھ میں
اے کوہِ صفا، اور صفائی ہوئی تجھ میں

تشریح: کعبہ وہ مکعب نما عمارت ہے جس کی طرف منہ کر کے سارے کرہ ارض کے مسلمان نماز پڑھتے ہیں۔ کعبہ بڑی حرمت والی جگہ ہے۔ بیت اللہ شریف کے اندر کسی جاندار کا خون بہانا بہت بڑا گناہ ہے۔ کعبہ شریف کی دائیں طرف کے ایک رکن سے مخاطب ہو کر انیس کہتے ہیں کہ اب اس کی شان و شوکت دکھانے کا وقت آگیا ہے۔ بیت مقدس (پاکیزہ گھر) سے مراد القدس ہے جو یروشلم میں حضرت سلیمانؑ نے تعمیر کیا تھا۔ انیس کہتے ہیں کہ اب اس کی عزت کا زمانہ آگیا ہے۔ جب خدا کے حکم سے عرب کے ریگزاروں میں سے اس مقام پر جسے آج مکہ مکرمہ کہتے ہیں حضرت ابراہیمؑ اپنے شیر خوار بیٹے حضرت اسماعیلؑ اور بیوی ہاجرہ کے لیے تھوڑا سا کھانے پینے کا سامان کچھ کھجوریں اور پانی کا مشکیزہ چھوڑ گئے۔ جب یہ سامان ختم ہو گیا تو حضرت حاجرہؑ نے عالم پریشانی میں صفا اور مروہ کی پہاڑیوں کے سات چکر لگائے۔ حضرت اسماعیل زمین پر لیٹے ہوئے پیاس کی شدت سے ایڑیاں رگڑ رہے تھے پانی کا ایک چشمہ پھوٹ پڑا۔ اسے زمزم کہتے ہیں۔ چشمہ زمزم سے مخاطب ہو کر انیس کہتے ہیں کہ اے چشمہ زمزم اب کے تجھ سے محبت کرنے کے دن آگئے ہیں۔ ظاہر ہے جو لوگ بیت اللہ کی زیارت کو جاتے ہیں آبِ زمزم ضرور پیتے ہیں۔ اے بیت اللہ شریف کے پتھر (مراد ہے حجر اسود) اب تیری سیاہی کم ہو کر تجھ میں چمک پیدا ہوئی۔ صفا اس پہاڑ کا نام تھا جس پر چڑھ کر حضور نے پہلے پہل اپنی نبوت کا اعلان کیا تھا۔ پھر کوہ صفا سے کہتے ہیں اے کوہ صفا اب تری عزت میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔ مراد یہ ہے کہ حضرت امام حسینؓ کی ولادت باسعادت سے ہر چیز کی عزت و تکریم میں اضافہ ہو گا۔

اے یثرب و بطحا، ترے والی کی ہے آمد　　اے رتبۂ عالی، شہ عالی کی ہے آمد
عالم کی تغیری پہ بحالی کی ہے آمد　　کہتے ہیں چمن، ماہِ جلالی کی ہے آمد
یہ خانۂ کعبہ کے مباہات کے دن ہیں
یعقوبؑ سے یوسفؑ کی ملاقات کے دن ہیں

تشریح: مدینے کا پرانا نام یثرب تھا۔ بطحا کے لفظی معنی زمین کا وسیع ٹکڑا جو پانی کی گزر گاہ ہو اور جہاں سنگریزے بکثرت ہوں، مراد ہے وادی مکہ معظمہ۔ انیس کہتے ہیں کے اے مدینے اور مکے کی سرزمین تمہارے تقدس کا محافظ ہے جو زمانے کے بگڑے ہوئے حالات کی اصلاح کر دے گا دنیا میں ایک صحت مند انقلاب لائے گی۔ باغات کہہ رہے ہیں کہ شان و شکوت اور عظمت والے مہینے کی آمد ہے۔ مراد یہ ہے کہ شعبان وہ عظمت والا مہینہ ہے جس میں امام حسینؓ جیسی عظیم المرتبت ہستی پیدا ہو گئی۔ یہ وہ دن ہیں جب خانہ کعبہ شیخی مارے گا۔ حضرت یعقوبؑ بنی اسرائیل کے بڑے جلیل القدر پیغمبر تھے۔ ان کا لقب اسرائیل تھا۔ انہیں اپنے بارہ بیٹوں میں سب سے زیادہ یوسفؑ پیارے تھے۔ بھائیوں نے حسد کی بنا پر انہیں کنویں میں پھینک دیا۔ وہاں سے نکال کر انہیں مصر کے بازار میں ایک غلام کی حیثیت سے بیچا گیا۔ زلیخا سے شادی ہوئی، مصر کے حاکم بنے جبکہ باپ ان کی جدائی کے غم میں روتے روتے اندھے ہو گئے۔ پھر یوسف علیہ السلام کی بھیجی ہوئی قمیص آنکھوں پر لگانے سے بینائی لوٹ آئی اور آخر کار اپنے چہیتے بیٹے یوسف علیہ السلام سے ان کی ملاقات ہوئی۔ اتنے لمبے عرصے کی جدائی کے بعد باپ بیٹے کی ملاقات کس قدر جذباتی ہو گی! کس قدر خوشی و مسرت کا لمحہ ہو گا۔ انیس کہتے ہیں کہ ایسا لازوال خوشی کا موقع آنے والا ہے۔

یا ختم رسولؐ گوہر مقصود مبارک　　یا نورِ خدا رحمتِ معبود مبارک
یا شاہِ نجف شادیِ مولود مبارک　　یا خیر النساء اخترِ مسعود مبارک
رونق ہو سدا نور دوبالا رہے گھر میں
اس ماہِ دوہفتہ کا اجالا رہے گھر میں

حضرت محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے آخری نبی ہیں۔ آپ کے بعد کوئی اور نبی نہیں آئے گا۔ نبی اکرمؐ سے مخاطب ہو کر انیس کہتے ہیں کہ اے آخری نبیؐ! آپ کو اپنی مراد کا موتی ملنا مبارک ہو۔ اے اللہ تعالیٰ کے نور کی آپ پر رحمت ہوئی ہے، مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ صوفیاء کا عقیدہ ہے کہ اللہ نے اپنے نور سے کچھ نور جدا کر کے محمدؐ کا نور بنایا پھر آپ کے نور سے ساری کائنات بنائی۔ معلوم ہوا آپ خدا کا نور ہیں۔ حضرت علیؓ نجف اشرف میں مدفون ہیں اس لیے

انہیں شاہِ نجف کہا گیا ہے۔ انیس کہتے ہیں کہ اے نجف کے شہنشاہ آپ کو بیٹے کی پیدائش مبارک ہو۔ اے عورتوں میں سب سے افضل اور خوش نصیب! آپ کو بیٹا مبارک ہو۔ خیر النساء حضرت فاطمہؓ کو کہا گیا ہے۔ ظاہر ہے حضرت علیؓ کی بیوی اور حسینؓ کی والدہ تھیں۔ خدا کرے ہمیشہ آپ کے گھر میں رونق رہے، چہل پہل اور گہما گہمی رہے گھر میں روشنی زیادہ ہو۔ ماہ دو ہفتہ یعنی چودھویں کا چاند کنایہ ہے حضرت امام حسینؓ سے۔ اس چودھویں رات کے چاند کا اجالا آپ کے گھر میں رہے۔ مراد یہ ہے کہ آپ کا گھرانا خوب پھلے پھولے اور آباد و شاداب رہے۔

اے اُمتیو! ہے یہ دمِ شکر گزاری ہر بار کرو سجدۂ شکریۂ باری

اللہ نے حل کر دیا مشکل کو تمہاری فردیں عملِ زشت کی اب چاک ہیں ساری

لکھے گئے بندوں میں ولی ابن ولی کے

ناجی ہوئے صدقے سے حسین ابن علیؓ کے

تشریح: اے حضورؐ کی امت سے تعلق رکھنے والو! یہ اللہ کی بہت بڑی شکر گزاری کا وقت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت امام حسینؓ جیسی شخصیت پیدا کر کے امت اسلامیہ کو فخر کا مقام عطا کیا ہے۔ جتنی دفعہ بھی اللہ تعالیٰ کے حضور میں سجدہ کرو کم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمہاری مشکل کو حل کر دیا ہے۔ برے اعمال کی ساری فہرستیں اب پھاڑ کر پھینک دی گئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے امام حسینؓ کی پیدائش کی خوشی میں گناہ گاروں کے گناہ معاف کر دیے ہیں۔ شاعر کا نام ولیوں کے خاندان کے غلاموں میں لکھا ہے۔ مسلمان صوفیاء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ولایت کا سلسلہ حضرت علیؓ سے شروع ہوا۔ حضرت علیؓ کے بیٹے حسینؓ کی طفیل ہماری نجات ہو گئی ہے۔ اہل شیعہ کے عقیدے کے مطابق اہلِ بیت پر ایمان لانا نجات کا ذریعہ ہے۔

قصیدہ

لفظ قصیدہ عربی لفظ "قصد" سے بنا ہے، اس کے لغوی معنی قصد (ارادہ) کرنے کے ہیں۔ گویا قصیدے میں شاعر کسی خاص موضوع پر اظہارِ خیال کا قصد کرتا ہے۔ اس کے دوسرے معنی مغز کے ہیں یعنی قصیدہ اپنے موضوعات و مفاہیم کے اعتبار سے دیگر اصنافِ شعر کے مقابلے میں وہی نمایاں اور امتیازی حیثیت رکھتا ہے، جو انسانی جسم و اعضا میں سر یا مغز کو حاصل ہوتی ہے۔ فارسی میں قصیدے کو "چامہ" بھی کہتے ہیں۔ اصطلاحی معنوں میں قصیدے سے مراد ایک ایسی نظم ہے جس میں کسی کی مدح یعنی تعریف بیان کی جائے۔

قصیدہ ہیئت کے اعتبار سے غزل سے ملتا ہے۔ بحر شروع سے آخر تک ایک ہی ہوتی ہے۔ پہلے شعر کے دونوں مصرعے باقی اشعار کے آخری مصرعے ہم قافیہ و ہم ردیف ہوتے ہیں۔ قصیدے میں ردیف لازمی نہیں۔

قصیدے کا آغاز مطلعے سے ہوتا ہے۔ ایک قصیدے میں اشعار کی تعداد کم سے کم پانچ ہے۔ زیادہ سے زیادہ کی حد مقرر نہیں۔ اُردو اور فارسی میں کئی کئی سو اشعار کے قصیدے بھی ملتے ہیں۔ قصیدہ عموماً چار اجزاء پر مشتمل ہوتا ہے۔

تشبیب:

قصیدے کا ابتدائی حصہ تشبیب کہلاتا ہے۔ تشبیب کے معنی ذکرِ شباب کے ہیں۔ مگر تشبیب کے لیے موضوع کی کوئی پابندی نہیں ہوتی۔ تشبیب کے اشعار عموماً عشقیہ یا بہاریہ ہوتے ہیں۔

گریز:

تشبیب کے بعد جب قصیدہ نگار اصل موضوع کا ذکر کرتا ہے تو اسے گریز کہتے ہیں۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ تشبیب اور قصیدے کے اصل مضمون (مدح یا ذم وغیرہ) کو فنکاری سے ایک دوسرے سے ملایا جائے۔ مثلاً تشبیب میں شاعر شکایتِ زمانہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اب ساری مصیبتیں ختم ہو جائیں گی۔ کیونکہ میں نے ایسے شخص کا دامن تھام لیا ہے جو دنیا میں سخاوت و فیاضی میں اپنی مثال آپ ہے۔ پھر شاعر ممدوح کی تعریف شروع کر دیتا ہے۔ اچھی گریز، قصیدے کی خوبی ہوتی ہے، تشبیب اور گریز میں ربط جتنا عمدہ اور فطری ہو گا قصیدہ اتنا ہی بلند پایہ سمجھا جائے گا۔

مدح:

اس حصے میں قصیدہ گو ممدوح کے اوصاف بیان کرتا ہے، یعنی اس کی عظمت و شوکت، شرافت، عدل و انصاف، شجاعت و بہادری، دینداری و خدا ترسی، قناعت و راست بازی اور علم دوستی وغیرہ۔ بعض اوقات ممدوح کے ساز و سامان مثلاً اس کے گھوڑے، تلوار، فوج اور ہاتھی وغیرہ کی بھی تعریف کی جاتی ہے۔

دعا:

آخری حصے میں ممدوح کو دعا دی جاتی ہے، بعض اوقات شاعر اپنی اچھی یا بُری حالت ظاہر کرتا ہے۔ دعا کے ذریعے قصیدہ گو اپنا صلہ بھی طلب کرتا ہے۔ دعائیہ قصیدے میں نازک مقام ہے اور قصیدے کی کامیابی کا انحصار بڑی حد تک دعائیہ پر ہوتا ہے۔ قصیدے کے مقطع میں شاعر اپنا تخلص لاتا ہے۔

قصیدے کے لیے موضوع کی قید نہیں۔ خاص طور سے عربی قصیدے میں موضوعات کی رنگارنگی نظر آتی ہے لیکن فارسی شاعروں نے قصیدے کو خوشامد اور حصولِ انعام کے لیے بادشاہوں کی تعریف تک محدود کر لیا۔ ہجو بھی قصیدے ہی کی ایک قسم ہے جس میں کسی کی مذمت یا برائی بیان کی جاتی ہے۔ اس کو ہجویہ قصیدہ کہا جاتا ہے۔

قصیدہ نگاری کو شاعری کا کمال سمجھا جاتا ہے اس لیے قصیدے کی زبان زور دار اور پر تکلف ہونی چاہیے۔ قصیدے میں خیالات کی بلند پروازی، مضمون آفرینی اور نازک خیالی ہوتی ہے۔ الفاظ وتراکیب اور تشبیہات واستعارات کے مناسب استعمال سے شاعر اپنی عملی قابلیت ظاہر کر سکتا ہے۔

آغاز وارتقاء:

قصیدے کی ابتداء عربی زبان میں ہوئی۔ زمانہ جاہلیت میں شعراء اپنے قبائلی تفاخر، مہم جوئی اور انتقامی جذبہ کے موضوع پر بڑھ چڑھ کر قصیدے لکھتے تھے۔ اسلام کا دور آیا تو پیغمبر اسلام کی شان میں نعتیہ قصیدے لکھے جانے لگے۔ اموی خلفاء کے دور میں درباری قصیدہ گو شاعر پیدا ہوئے اور انعام و اکرام کا بازار گرم ہوا البتہ بنو عباس میں قصیدہ صرف سلاطین کی مداحی تک مخصوص ہو گیا۔

عربوں نے ایران فتح کیا تو قصیدہ بھی ان کے ساتھ ایران پہنچا۔ یہاں اس نے خوب ترقی پائی۔ دربار داری کے تقاضوں کے پیش نظر انعام واکرام کا بازار گرم ہوا۔ فارسی شاعری میں رودکی، فرخی، عنصری، انوری، خاقانی، عرفی، نظیری اور فانی ایسے نامور قصیدہ گو شاعر گزرے ہیں۔

مسلمان بادشاہ جب برصغیر میں آئے تو ان کے ہمراہ درباری شاعر بھی یہاں پہنچے۔ فارسی چونکہ درباری زبان تھی اس لیے شروع میں فارسی میں ہی قصیدے کہے جاتے تھے۔ دکن میں اردو کے قصیدہ گو شاعر پیدا ہوئے جن میں نصرتی، غواصی، وجہی اور قلی قطب شاہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ لیکن ان کے قصائد کو زیادہ فروغ نہیں ہوا۔ قصیدے کی جڑیں حقیقت میں سودا کے ہاتھوں شمالی ہند میں مضبوط ہوئیں۔ انہوں نے سچ مچ قصیدے کو قصیدہ بنایا۔ میر نے بھی قصیدے کہے لیکن ان کو مقبولیت حاصل نہ ہو سکی۔ انشاء اور مصحفی نے بھی قصیدے لکھے لیکن قبول عام نہ ہو سکے۔

دہلوی شعراء میں ذوق، غالب اور مومن نے اس میدان میں شہرت حاصل کی۔ اس فن میں سودا کے بعد ذوق کا مقام سب سے بلند ہے۔ اپنی قصیدہ گوئی کی بدولت ذوق کو خاقانیِ ہند کا لقب ملا۔ غالب نے اردو فارسی میں کئی قصیدے لکھے ہیں جن میں خوبصورتی اور چاشنی موجود ہے۔ مومن کے قصائد میں دو مدحیہ اور باقی مذہبی موضوعات سے متعلق ہیں۔

مومن کے بعد قصیدہ گوئی زوال پذیر ہو گئی۔ متاخرین میں اگرچہ داغ، محسن کاکوری اور قدر بلگرامی نے اس صنف میں طبع آزمائی کی لیکن دربار کا دور ختم ہو چکا تھا۔ رئیسوں اور نوابوں کی محفلیں برخاست ہو چکی تھیں۔ اس لیے قصیدے کا بھی خاتمہ ہو گیا البتہ مذہبی اور بزرگانِ دین کی شان میں قصیدے لکھے جانے لگے۔ اس ضمن میں محسن کاکوروی کے نعتیہ قصائد بے حد مقبول ہوئے۔ موجودہ دور میں عبدالعزیز خالد واحد شاعر ہیں جنہوں نے انتہائی اعلیٰ درجے کے قصائد کہے ہیں۔

محمد رفیع سودا

محمد رفیع سودا' 1713ء میں دہلی، بھارت میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد محمد شفیع بہ سلسلہ تجارت ہندوستان میں وارد ہوئے تھے۔ مرزا سودا کی تعلیم و تربیت دہلی میں ہوئی۔ چھوٹی عمر میں شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ اور فارسی میں شعر کہنے لگے۔ پھر خان آرزو کے کہنے پر اردو میں طبع آزمائی شروع کی اور سلیمان قلی داد سے اصلاح لی۔ بعد میں شاہ حاتم کے شاگرد ہوئے اور تھوڑے عرصے میں درجہ کمال حاصل کر کے بڑے بڑے استادوں سے خراج تحسین وصول کیا، یہاں تک کہ شاہ عالم کو بھی شاگردی کا شوق ہوا۔ اور اصلاح لینے لگے لیکن تھوڑے ہی عرصے میں زمانے نے پلٹا کھایا اور دہلی تباہ ہوگئی۔

جب مرہٹوں نے لوٹ مار شروع کردی چنانچہ شعراو شرفاء دہلی سے نکلنے لگے۔ ناچار سودا نے بھی فرخ آباد نواب بنگش کے یہاں آکر قیام کیا اور سترہ سال تک آسودگی سے یہیں زندگی بسر کی۔ اس وقت مرزا کی عمر ساٹھ سال کی تھی۔ نواب کی وفات پر مرزا لکھنؤ چلے آئے، یہاں نواب شجاع الدولہ نے بڑی قدر کی۔ مگر معمولی سی بات پر ناراض ہو کر چلے آئے اور پھر دوبارہ دربار نہ گئے۔ یہاں تک کہ آصف الدولہ مسند آراء ہوئے۔ وہ مرزا پر بڑے مہربان تھے۔ چھ ہزار سالانہ وظیفہ مقرر ہوا اور ملک الشعراء کا خطاب ملا۔ مرزا نے تقریباً ستر برس کی عمر میں 1781ء میں لکھنؤ میں وفات پائی۔

قصیدہ گوئی

سودا کا شمار اردو کے بلند پایہ قصیدہ نگار شعراء میں ہوتا ہے۔ سودا کی عظمت کا اس بات سے پتہ چلتا ہے کہ انہی کے قصیدوں سے اردو قصائد نگاری ایک نئے موڑ میں داخل ہوتی ہے اردو قصیدہ کو پہلی بار سودا کی بدولت بلند مقام، ایک بلند مرتبہ اور ایک بلند روایت ملی۔ سودا نے اردو قصیدہ کو ایک بھرپور اور توانا روایت سے آشنا کیا اس میں نئے مضامین کا اضافہ کیا نئے خیالات، نئے موضوعات داخل کئے اور ممکن حد تک اس کی حدود وسیع سے وسیع تر کردیں۔ سودا کی کلیات میں ۹۳ مدحیہ اور ٤ ہجویہ قصائد ملتے ہیں۔ بزرگانِ دین میں انہوں نے پیغمبر اسلام، حضرت فاطمہ، حضرت علی اور دیگر ائمہ کی تعریف کی ہے۔ اربابِ دینوی میں ان کے ممدوح عالمگیر ثانی، شاہ عالم، آصف جاہ، شجاع الدولہ، آصف الدولہ، نواب نسبت خان وغیرہ اور اودھ کے انگریز ریذیڈنٹ رچرڈسن شامل ہیں۔

مطلع:۔

قصیدے کی ابتداء مطلع سے ہوتی ہے قصیدے کی فنی خوبیوں اور خامیوں کا انحصار مطلع پر ہے۔ اس لئے شاعر کی کوشش ہوتی ہے کہ مطلع دلکش ہو اور جدت خیال اور جدت بیان سے ایسی ندرت اور ایسی شیفتگی پیدا کردے کہ سننے اور پڑھنے والا چونک جائے اور اس کی توجہ جذب کرے۔ سودا اس فن کے ماہر ہیں ان کے مطلعے اس فن پر پورے اُترتے ہیں اور کامیابی سے تاثر پیدا کرتے ہیں۔ حضرت فاطمہ کی مدح میں قصیدے کا مطلع

بکھرے سے اپنے زلف کے پردے کو تو اُٹھا
ابر سیہ میں ماہ درخشاں کو مت چھپا

تشبیب

سودا کی بعض تشبیبیں بہاریہ ہیں، بعض رندانہ، بعض عاشقانہ، بعض میں شکایت زمانہ ہے بعض میں حکیمانہ واخلاقی نکات، بعض میں شاعرانہ تعلی ہے۔ بعض میں معاصر شعراء پر تعریض، بعض میں خوشی کو مجسم کیا ہے۔ یہ تشبیبیں بجائے خود چھوٹی چھوٹی نظمیں تصور کی جاسکتی ہیں جن میں موضوع کی وحدت ہے اور سودا کا فن اپنے عروج پر نظر آتا ہے۔ بہاریہ تشبیب ان الفاظ میں باندھی گئی ہے۔

اُٹھ گیا بہمن ودے کا چمنستان سے عمل
تیغ اُردی نے کیا ملکِ خزاں مستاصل

واسطے خلعتِ نوروز کے ہر باغ کی بیچ
آب جو قطع لگی کرنے روش پر مخمل

گریز:

تشبیب اور مدح کے درمیان غیر محسوس جوڑ لگانا گریز کہلاتا ہے۔ اس میں شاعر کی قادرالکلامی کا پتہ چلتا ہے۔ تاہم سودا اس پل صراط سے بڑی مہارت سے گزر گئے ہیں۔ ایک قصیدہ جو حضرت علی کی شان میں ہے اس کی تشبیب میں معشوق کی بے وفائی کا گلہ کرتے ہوئے حضرت علی کی مدح کی طرف آنے میں گریز کا حسن ملاحظہ فرمایئے

فریاد کروں کس سے رواداری کی تیرے
کہنے کے لئے گبرُ و مسلماں ہے برابر

مدح:

گریز کے بعد قصیدے کا اہم حصہ آتا ہے یعنی مدح، قصیدہ دراصل کسی کی مدح کے لئے لکھا جاتا ہے۔ اس لئے شاعر اپنی ساری توانائیاں اس میں صرف کرتا ہے۔ اس میں شاعر ممدوح کے جلال وجمال عظمت وبزرگی، شجاعت وجرات اور عدل وانصاف کی تعریف کرتا ہے جب قصیدہ نعت ومنقبت کے رنگ میں ہوتا ہے۔ تو ممدوح کے مزار اور روضہ کی بھی تعریف کی جاتی ہے۔ لیکن قصیدہ نگار کو مدح میں ایک بات کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے سلاطین، اُمرا اور اہلِ دین کی مدح کے انداز میں فرق مراتب قائم کرنا ضروری ہوتا ہے۔ سودا کے مدح میں یہ فرق مراتب قائم رہتا ہے۔ مثلاً ایک قصیدے میں رسول اکرم کی مدح کرتے ہیں وہ رسول کی عظمت اور تقدس کا ذکر کرتے ہیں۔

ملک سجدہ نہ کرتے آدم خاکی کو ، گر اُس کی
امانت دار نور احمدی ہوتی نہ پیشانی

مگر جب سودا حضرت علی کی مدح کرتے ہیں تو زیادہ تر ان کی شجاعت پر روشنی ڈالتے ہیں۔

جمع کب رہ سکیں اعدا کے حواسِ خمسہ
دیکھ کر اس کو علم ہاتھ میں تیرے یک پل

حسنِ خاتمہ یا دُعائیہ:

قصیدے کے آخری حصہ حسنِ خاتمہ یا دعائیہ کہلاتا ہے۔ اس میں شاعر ممدوح کو دعا دیتا ہے اور اس کے دشمنوں کو بددعا دیتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اپنا مدعا بھی بیان کرتا ہے۔ یہ بالکل رسمی چیز ہے۔ سودا نے بھی اس رسم کو برتا ہے سودا کے ایک قصیدے کا دُعائیہ ملاحظہ ہو۔ سودا عالمگیر ثانی کو یوں دعا دیتے ہیں۔

سودا کرے ہے ختم دعائیہ پر سخن
اس جا نہیں ہے طول سخن مقتضائے داب
اس تخت پر بہ مسند اقبال بیٹھ کر
کرتا رہے تو شادی نو روز ای جناب

تشریح

اُٹھ گیا بہمن ودے کا چمنستاں سے عمل　　　　تیغِ اُردی نے کیا ملکِ خزاں مُستاصل

تشریح: سودا کے ایک بہت مشہور قصیدہ بہاریہ کی یہ تشبیب کا پہلا شعر ہے۔ اس میں بہار کے مضمون کو بیان کیا گیا ہے۔ بہمن ایرانی سال کا گیارہواں اور دی دسواں مہینہ ہے۔ سودا کہتے ہیں باغ میں سے خزاں اور بر فباری کے مہینوں کا راج ختم ہو چکا ہے۔ گویا خزاں کے دن ختم ہو چکے ہیں۔ اردی بہشت ایرانی سال کے بارہویں مہینے کی تلوار نے خزاں کا ملک فتح کر لیا ہے۔ اس کی حکمرانی جڑ سے اکھیڑ پھینکی ہے۔ دوسرے لفظوں میں سردی اور خزاں کا دور ختم ہو چکا ہے اور بہار کی آمد آمد ہے۔ چنانچہ اب ساری دنیا میں موسم بہار کی حکمرانی ہے۔

سجدۂ شُکر میں ہے شاخِ ثمر دار ہر ایک　　　　دیکھ کر باغِ جہاں میں کرمِ عزَّ وَ جَل

تشریح: موسم کی اس تبدیلی کے باعث نیچے جھکی ہوئی پھلدار شاخیں صرف پھلوں کے بوجھ سے نہیں جھک گئیں بلکہ موسم بہار کے آنے پر شکر کا سجدہ ادا کرنے کے لیے جھکی ہوئی ہیں کیونکہ انہیں دنیا کے باغ میں ہر طرف اللہ تعالیٰ کی بزرگی اور برتری کی مہربانی اور نوازش کار فرما نظر آتی ہے۔ اس کے رعب داب کے سامنے انہوں نے اپنے سر جھکا دیئے ہیں۔

قوتِ نامیہ لیتی ہے نباتات کا عَرَض　　　　ڈال سے پات تلک پھول سے لے کر تا پھل

اس قصیدہ بہاریہ کی تشبیب کے اس شعر میں سودا کہتا ہے کہ تمام اُگنے والی چیزوں کی ہر ایک شاخ، پتے، پھل اور پھول نشوونما پانے کی قوت پوری شدت سے جاری وساری ہے۔ اس سے مراد یہ ہے ٹہنیاں، پھل، پھول اور پتے بڑی تیزی سے بڑھ رہے ہیں۔ نشوونما پانے کی قوت تھوڑی دیر کے بعد پودوں کی لمبائی اور چوڑائی کو ناپتی ہے کہ اس میں خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے یا نہیں۔

واسطے خِلعتِ نَوروز کے ہر باغ کے بیچ　　　　آب جو قطع لگی کرنے رَوِش پر مخمل

نوروز ایرانی سال کا پہلا دن ہوتا ہے۔ اس دن جشن منایا جاتا ہے۔ پہلے یہ پارسیوں یا آتش پرستوں کا دن تھا اب حضرت علی کا یوم پیدائش ہونے کے ناتے منایا جاتا ہے۔ نوروز کو لوگ نئے کپڑے پہنتے ہیں اور یار دوستوں کو کھانے پر بلاتے ہیں۔ خلعت اس قیمتی لباس کو کہتے ہیں جو کسی موقع کی مناسبت سے سلوا کر پہنا جائے۔ شاعر کہتا ہے کہ نوروز آپہنچا ہے اور باغ کو خلعت پہنانے کے لیے ندی کے پانی نے باغ کی پگڈنڈیوں پر کاٹ کا ٹکر مخمل بچھانا شروع کر دیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں باغ کی ہر روش پر مخمل جیسی نرم و ملائم گھاس اُگ آئی ہے۔

عکسِ گُلبُن یہ زمیں پر ہے کہ جس کے آگے　　　　کارِ نقاشیِ مانی ہے دُوَم وہ اوّل

مانی ایران کا مشہور مصور، عراق میں پیدا ہوا اور فن مصوری سیکھنے چین چلا گیا۔ اس نے ارژنگ نامی مصوری کی کتاب اپنی نبوت کے ثبوت کے طور پر پیش کی۔ اس البم میں جنت اور دوزخ کی زندگی کے مناظر تھے۔ بادشاہ نے اس کو زرتشتی موبدوں کے اختیار میں دے دیا۔ انہوں نے اسے اذیت دے کر مار ڈالا) اس کے مذہب کا نام "مانویت" تھا۔ شاعر کہتا ہے کہ پھولوں سے لدی ہوئی شاخوں کا عکس جو زمین پر پڑتا ہے اور اتنا خوبصورت اور خوشنما ہے کہ مانی جیسے بلند پایہ مصور کی نقاشی کا شاہکار اس کا البم ارژنگ بھی اس کے سامنے کچھ حیثیت نہیں رکھتا۔

جوشِ روئیدگیِ خاک سے کچھ دُور نہیں　　　　شاخ میں گاؤ زمیں کی ہے جو پھوٹے کونپل

زمین میں سبزہ اُگانے کی صلاحیت اس قدر بڑھی ہوئی اور جوش میں آئی ہوئی ہے کہ وہ روایتی گائے جس کے سینگوں پر ہندوانہ عقیدے کے مطابق زمین ٹھہری ہوئی ہے۔ مبالغہ آرائی کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے کہ کچھ عجب نہیں کہ اس روایتی گائے کے سینگ میں سے بھی ایک کونپل پھوٹ نکلے۔ زمین کی اگانے کی صلاحیت اس قدر زیادہ ہے کہ مٹی کے بے جان سے بے جان ٹکڑے میں بھی زندگی کے آثار پیدا ہو گئے ہیں اور وہاں سے پھول اور سبزہ اُگ آیا ہے۔

فکر رہتی ہے مجھے یہ کہ زباں سے اپنے　　　　کہیں دعوئے خدائی نہ کریں لات وہُبَل

تشریح: لات، زمانہ قبل از اسلام کی ایک دیوی کا نام ہے جس کا مندر طائف میں تھا۔ بعض روایتوں میں اسے حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم نے بنایا تھا۔ یہ بت سفید پتھر سے مربع شکل کا بنا ہوا تھا۔ ہبل، دورِ جاہلیت کا سب سے بڑا بت تھا جو خانہ کعبہ کی چھت پر تھا۔ شکل و صورت میں یہ انسان سے مشابہ تھا اور سرخ عقیق کا بنا ہوا تھا۔ فتح مکہ پر نبی اکرمؐ نے اسے توڑا۔ شاعر کہتا ہے کہ قوت نامیہ اس قدر عروج پر ہے کہ کہیں ان بے جان بتوں میں بھی جان نہ پڑ جائے اور وہ اپنی خدائی کا دعویٰ کرنے لگیں کیونکہ یوں لگتا ہے کہ ان پتھروں میں زندگی کے آثار پیدا ہو رہے ہیں۔

اور میرا سُخن ہے آفاق میں تایومِ قیام　　　رہے گا سبز، بہَر مجمع وہَر یک دَنگل

تشریح: سودا کہتے ہیں کہ میں نے جو اشعار کہے ہیں۔ وہ قیامت تک ہر محفل میں نہایت احترام اور عقیدت کے ساتھ سنے جائیں گے اور ہر ایک شاعر کے لیے ایک چیلنج ہوگا کہ اس جیسا قصیدہ لکھ کر دکھائے۔ اس شعر میں تعلی پائی جاتی ہے جو قصیدہ گوئی کی ایک اہم خصوصیت ہے۔

ہے مجھے فیض سخن اس کی ہی مدّاحی کا　　　ذات پر جس کے مُبَرہَن ہَن کُنہِ عَزَّوَجل

تشریح: اور مجھے شاعری میں جو مرتبہ ملا ہے اور مجھے شعر کہنے کا ملکہ حاصل ہوا ہے وہ صرف حضرت علی کرم اللہ وجہ کی مدح سرائی سے حاصل ہوا ہے کیونکہ ان کی ذات کی بزرگی اللہ تعالیٰ کی دلیل سے ثابت ہے۔

مہر سے جن کی منور رہے دل جُوں خُورشید　　　رُوسیہ کینے سے جس کے رہے مانندِ زُحَل

تشریح: جس دل میں حضرت علیؓ کی محبت اور عقیدت ہوتی ہے وہ سورج کی طرح روشن اور منور ہوتا ہے اور آپؓ کے لیے دل میں بری سوچ رکھنے والے سورج کے گرد چکر لگانے والے منحوس سیارے زحل کی طرح ہوتے ہیں اور حسد کی آگ میں جلتے اور پیچ و تاب کھاتے رہتے ہیں۔

شعلۂ شمع کی گرمی سے یقیں ہے دل پر　　　شب سے تا صبحِ قیامت نہ سکے موم پگھل

تشریح: حضرت علی کی منقبت بیان کرتے ہوئے سودا کہتے ہیں کہ اگر کسی شخص کے دل میں آپؓ کے نام کی شمع جل اٹھے اور اس کے شعلے کی روشنی اور گرمی وہاں موجود ہو تو اس رات سے قیامت کی صبح تک وہ شمع اس شخص کے دل میں یونہی جلتی رہے گی یعنی قیامت کی صبح ہونے تک اس شخص کے دل میں آپؓ کی محبت موجود رہے گی۔ شمع کے جلنے سے موم پگھلتا رہتا ہے اور جب سارا موم پگھل جائے تو شمع بجھ جاتی ہے۔ سودا یہ کہنا چاہتے ہیں کہ یہ ایک ایسی شمع روشن ہو جائے گی جس کا نہ موم پگھلے گا اور نہ یہ بجھے گی۔

گر اسے کر کے بیاں سمجھوں، ثنا کی میں نے　　　خلق سمجھے گی دماغ اس کا ہوا ہے مُختَل

تشریح: حضرت علیؓ کی مدح سرائی کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے کہ اگر میں اِدھر اُدھر سے آپ کی تعریف بیان کروں تو لوگ سمجھیں گے کہ اس کا دماغ چل گیا ہے، پاگل ہو گیا ہے۔ شاعر کہنا چاہتا ہے کہ آپؓ کی جتنی بھی تعریف کی جائے، تعریف کرنے کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔

وصف تیرے کی ہے شایاں، زُباں تیری ہے　　　سمجھے تُو آپ کو یا تجھ کو خداوندِ اَجل

تشریح: شاعر کہتا ہے کہ آپؓ کی تعریف کرنے کے لیے آپؓ جیسی مبارک زبان درکار ہے کیونکہ آپؓ اللہ کو خوب سمجھتے اور جانتے ہیں۔

طاقتِ طُولِ سُخن آگے بھی تک سودا آ تو　　　بخش اے قوتِ بازوئے نبیِ مُرسَلؐ

تشریح: اے سودا! تو نے جو حضرت علیؓ کی تعریف میں شعر کہنے شروع کیے ہیں اس سلسلے کو ذرا اور آگے بڑھا تا کہ خدا کے بھیجے ہوئے نبی حضرت محمدؐ کے بازو کی قوت تیری بخشش کا ذریعہ بن جائے۔

چاہتا ہے کرے آخر وہ دعائیہ پر　　　نظم تجھ مدح کی بہتر ز کلام اوّل

تشریح: شاعر کہتا ہے کہ میں چاہتا ہوں کہ اپنے ان مدحیہ اشعار کا خاتمہ دعائیہ کلمات کے ساتھ کروں کیونکہ میرا مقصد تو شروع سے ہی آپ کو اپنے کلام میں بڑی عزت کے ساتھ بیان کرنا تھا۔

تا مُسمّٰی رہے یہ نظم بہ بابُ الجنّت　　　　جب تلک اس سے بر آوے مری اُمید واہل

تشریح: تاکہ یہ نظم جس کا نام میں نے جنت کا دروازہ رکھا ہے اسم با مسمیٰ بن جائے کیونکہ اس سے ہماری امیدیں اور مرادیں پوری ہوں گی۔

نخل اُمید سے تیرے ہوں بَر و مَند مُحِب　　　　ہو محبت نہ تری جن کو نہ پاویں وہ پھل

تشریح: حضرت علیؓ سے مخاطب ہو کر شاعر کہتا ہے کہ جو آپ کو چاہنے والے ہیں انہیں اُمید ہے کہ ایک نہ ایک دن وہ آپؓ کی محبت کے صدقے ضرور بخشے جائیں گے اور ان کی اس امید کا درخت بار آور ہو گا۔ اسی طرح جن کے دل میں آپ کی محبت نہیں وہ نامراد رہیں گے۔

نعت (احمد رضا)

مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام
شمعِ بزمِ ہدایت پہ لاکھوں سلام
مہرِ چرخِ نبوت پہ روشن درود
گلِ باغِ رسالت پہ لاکھوں سلام
شہر یارِ ارم ، تاجدارِ حرم
نو بہارِ شفاعت پہ لاکھوں سلام
جس کے ماتھے شفاعت کا سہرا رہا
اُس جبینِ سعادت پہ لاکھوں سلام
کاش محشر میں جب اُن کی آمد ہو اور
بھیجیں سب اُن کی شوکت پہ لاکھوں سلام

نعت (ظفر علی خان)

دل جس سے زندہ ہے وہ تمنا تمہی تو ہو
ہم جس میں بس رہے ہیں وہ دنیا تمہی تو ہو
مجھ پُر خطا کی لاج تمہارے ہی ہاتھ ہے
مجھ ننگ دو جہاں کا وسیلہ تمہی تو ہو
جلتے ہیں جبرائیل کے پر جس مقام پر
اس کی حقیقتوں کے شناسا تمہی تو ہو
جو دستگیر ہے وہ تمہارا ہی ہاتھ ہے
جو ڈوبنے نہ دے وہ سہارا تمہی تو ہو
سب کچھ تمہارے واسطے پیدا کیا گیا
سب غایتوں کی غایتِ اُولیٰ تمہی تو ہو

ولی دکنی

مت غصے کے شعلے سوں جلتے کوں جلاتی جا
ٹک مہر کے پانی سوں تو آگ بجھاتی جا
تجھ چال کی قیمت سوں دل نیئں ہے مرا واقف
اے مان بھری چنچل ٹک بھاؤ بتاتی جا
اس رات اندھیاری میں مت بھول پڑوں تجھ سوں
ٹک پاؤں کے جھانجے کی جھنکار سناتی جا
مجھ دل کے کبوتر کوں پکڑا ہے تری لٹ نے
یہ کام دھرم کا ہے ٹک اس کو ں چھڑاتی جا
تجھ مکھ کی پرستش میں گئی عمر میری ساری
اے بت کی پجن ہاری ٹک اس کو ں پجاتی جا
تجھ گھر کی طرف سندر ، آتا ہے ولی دائم
مشتاق درس کا ہے ٹک درس دکھاتی جا

یاد کرنا ہر گھڑی اس یار کا
ہے وظیفہ مجھ دلِ بیمار کا
آرزوئے چشمۂ کوثر نہیں
تشنہ لب ہوں شربت دیدار کا
عاقبت کیا ہووے گا معلوم نئیں
دل ہوا ہے مبتلا دلدار کا
گر ہوا ہے طالبِ آزادگی
بند مت ہو سبحہ و زنار کا
اے ولی ہونا سریجن پر نثار
مدعا ہے چشمِ گوہر بار کا

میر تقی میر

جس سر کو غرور آج ہے یاں تاج وری کا
کل اس پہ یہیں شور ہے پھر نوحہ گری کا
آفاق کی منزل سے گیا کون سلامت
اسباب لُٹا راہ میں یاں ہر سفری کا
زنداں بھی شورش نہ گئی اپنے جنوں کی
اَب سنگ مداوا ہے اس آشُفتہ سری کا
ہر زخمِ جگر داورِ محشر سے ہمارا
اپنی تو جہاں آنکھ لڑی ، پھر وہیں دیکھو
آئینے کو لپکا ہے پریشاں نظری کا
ٹک میرؔ جگر سوختہ کی جلد خبر لے
کیا یار بھروسہ ہے چراغ سحری کا

ہے گی طلبِ شرط یاں کچھ تو کیا چاہیے
بیٹھے نہیں بنتی میاں ، کچھ تو کیا چاہیے
عشق میں اے ہمرہاں کچھ تو کیا چاہیے
گریہ و شور و فغاں ، کچھ تو کیا چاہیے
ہاتھ رکھے ہاتھ پر ، بیٹھے ہو کیا بے خبر
چلنے کو ہے کارواں ، کچھ تو کیا چاہیے
میں جو کہا تنگ ہوں ، مار مروں کیا کروں
وہ بھی لگا کہنے ہاں ، کچھ تو کیا چاہیے
یہ تو نہیں دوستی ، ہم سے جو تم کو رہی
پاسِ دلِ دوستاں، کچھ تو کیا چاہیے
میر نہیں پیر تم ، کاہلی اللہ رے
نامِ خدا ہو جواں ، کچھ تو کیا چاہیے

غالب

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا
ترے وعدے پہ جیے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا
کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیر نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا
یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا
کہوں کس سے میں کہ کیاہے شب غم بری بلا ہے
مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا
ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا
یہ مسائل تصوف ، یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے ، جو نہ بادہ خوار ہوتا

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے
جوشِ قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے
دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے
پندار کا صنم کدہ ویراں کیے ہوئے
پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں
سر زیرِ بارِ منتِ درباں کیے ہوئے
جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے
غالبؔ ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے
بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کیے ہوئے

علامہ اقبال

تیرے عشق کی انتہا چاہتا ہوں
مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں
ستم ہو کہ ہو وعدہ بے حجابی
کوئی بات صبر آزما چاہتا ہوں
یہ جنت مبارک رہے زاہدوں کو
کہ میں آپ کا سامنا چاہتا ہوں
ذرا سا تو دل ہوں مگر شوخ اتنا
وہی "لن ترانی" سنا چاہتا ہوں
کوئی دم کا مہماں ہوں اے اہلِ محفل
چراغِ سحر ہوں بجھا چاہتا ہوں
بھری بزم میں راز کی بات کہہ دی
بڑا بے ادب ہوں سزا چاہتا ہوں

جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی
کھلتے ہیں غلاموں پر اسرارِ شہنشاہی!
عطار ہو، رومی ہو ، رازی ہو ، غزالی ہو
کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحر گاہی!
نو مید نہ ان سے اے رہبر فرزانہ
کم کوش تو ہیں لیکن بے ذوق نہیں راہی
اے طائر لا ہوتی ، اُس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی !
آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بیباکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

حسرت موہانی

پھر بھی ہے تم کو مسیحائی کا دعویٰ دیکھو
مجھ کو دیکھو مرے مرنے کی تمنا دیکھو
ہم نہ کہتے تھے بناوٹ سے ہے سارا غصہ
ہنس کے لو پھر وہ انہوں نے ہمیں دیکھا دیکھو
گھر سے ہر وقت نکل آتے ہوکھولے ہوئے بال
شام دیکھو نہ مری جان سویرا دیکھو
سامنے سب کے مناسب نہیں ہم پہ یہ عتاب
سر سے ڈھل جائے نہ غصے میں دوپٹا دیکھو
سر کہیں ، بال کہیں ، ہاتھ کہیں ،پاؤں کہیں
ان کا سونا بھی ہے کس شان کا سونا دیکھو
ہوسِ دید مٹی ہے نہ مٹی گی حسرت
دیکھنے کے لیے چاہو انہیں جتنا دیکھو

چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے
ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانہ یاد ہے
تجھ سے کچھ ملتے ہی وہ بیباک ہو جانا مرا
اور ترا دانتوں میں وہ انگلی دبانا یاد ہے
کھینچ لینا وہ مرا پردے کا کونا دفعتاً
اور دوپٹے سے ترا وہ منہ چھپانا یاد ہے
تجھ کو جب تنہا کبھی پانا تو ازراہ لحاظ
حالِ دل باتوں ہی باتوں میں جتانا یاد ہے
دوپہر کی دھوپ میں میرے بلانے کے لیے
وہ ترا کوٹھے پہ ننگے پاؤں آنا یاد ہے
باوجودِ ادعائے اتقا حسرت مجھے
آج تک عہدِ ہوس کا وہ فسانہ یاد ہے

ناصر کاظمی

گئے دنوں کا سراغ لے کر کدھر سے آیا ، کدھر گیا وہ
عجیب مانوس اجنبی تھا ، مجھے تو حیران کر گیا وہ
بس ایک موتی سی چھب دکھا کر بس ایک میٹھی سی دھن سنا کر
ستارۂ شام بن کے آیا، برنگِ خواب سحر گیا وہ
خوشی کی رُت ہو کہ غم کا موسم، نظر اسے ڈھونڈتی ہے ہر دم
وہ بوئے گل تھا کہ نغمۂ جاں ، مرے تو دل میں اتر گیا وہ
کچھ اب سنبھلنے لگی ہے جاں بھی ، بدل چلا رنگِ آسماں بھی
جو رات بھاری تھی ٹل گئی ہے ، جو دن کڑا ہے گزر گیا وہ
شکستہ پا راہ میں کھڑا ہوں ، گئے دنوں کو بلا رہا ہوں
جو قافلہ میرا ہمسفر تھا ، مثالِ گردِ سفر گیاوہ
بس ایک منزل ہے بوالہوس کی ہزار رستے ہیں اہلِ دل کے
یہی تو فرق مجھ میں ، اس میں ، گزر گیا میں ، ٹھہر گیا وہ
وہ ہجر کی رات کا ستارہ وہ ہم نفس ہم سخن ہمارا
سدا رہے اس کا نام پیارا سنا ہے کل رات مر گیا وہ
وہ رات کا بے نوا مسافر ، وہ تیرا شاعر وہ تیرا ناصر
تری گلی تک تو ہم نے دیکھا تھا ، پھر نجانے کدھر گیا وہ

کسی کلی نے بھی دیکھا نہ آنکھ بھر کے مجھے
گزر گئی جرس گل اداس کر کے مجھے
میں سو رہاتھا کسی یاد کے شبستاں میں
میں رو رہا تھا مقدر کی سخت راہوں میں
اڑا کے لے گئے جادو تری نظر کے مجھے
میں تیرے درد کی طغیانیوں میں ڈوب گیا
پکارتے رہے تارے ابھرے ابھر کے مجھے
ترے فراق کی راتیں کبھی نہ بھولیں گی
مزے ملے انہیں راتوں میں عمر بھر کے مجھے
ذرا سی دیر ٹھہرنے دے اے غم دنیا
بلا رہاہے کوئی بام سے اتر کے مج

(مثنوی سحر البیان انتخاب)

پلا ساقیا[1] ساغرِ[2] بے نظیر[3]
پھنسی دامِ[4] ہجراں[5] میں بدرِ منیر

وہ حسن و جوانی اور اُس پہ یہ غم
ستم ہے ، ستم ہے ، ستم ہے ، ستم

جہاں بیٹھنا آہ کرنا اُسے
بہانا نزاکت پہ دھرنا اُسے

کبھی خون آنکھوں سے رو ڈالنا
کسی کو کبھی دیکھ دھو ڈالنا

خواصوں[6] کو بالا[7] بتانا اُسے
اکیلی درختوں میں جانا اُسے

ولے[8] اُن درختوں میں جس میں وہ ماہ[9]
سرِ شام چھپ چھپ کے کرتا نگاہ

سو یہ بھی پہر دن سے آ واں[10] مدام
اِسی چھاؤں میں بیٹھ کرتی تھی شام

گیا اِس طرح جب مہینہ گزر
کہ وہ ماہ مُطلق[11] نہ آیا نظر

اور اِس کا اِدھر رنگ گھٹنے لگا
جگر خوں ہو مژگاں[12] پہ بٹنے لگا

لگی رہنے تپ[13] جانِ بیتاب میں
لگا فرق آنے خور و خواب[14] میں

محبت کا سودا[15] سا ہونے لگا
جنوں تخم[16] وحشت کا بونے لگا

سَرکنے لگا پاسِ[17] ناموس و ننگ[18]
لگی عقل اور عشق میں ہونے جنگ

---

[1] شراب پلانے والے
[2] شراب کا پیالہ
[3] لاجواب
[4] جال
[5] جدائی
[6] خاص خادمائیں
[7] ٹالنا بہانے بنانا
[8] لیکن
[9] چاند مراد شہزادہ بے نظیر
[10] آتی تھی
[11] بالکل
[12] پلکیں
[13] بخار
[14] کھانے اور سونے میں
[15] جنون
[16] بیج
[17] لحاظ
[18] عزت و نیک نامی

خموشی اٹھانے لگی دل میں شور — جتانے[19] لگی ناتوانی بھی زور

یہ احوال دیکھ اُس کا دخت وزیر[20] — لگی جل کے کہنے کہ " بدرمنیر"

تو وہ ہے کہ سب کے تئیں[21] دے وقوف[22] — کدھر دل گیا تیرا اے بے وقوف!

مسافر سے کوئی بھی کرتا ہے پیت[23] — مثل ہے کہ جوگی[24] ہوئے کس کے میت[25]

اری چار دن کے ہیں یہ آشنا — ملا دل کو آخر کریں ہیں جدا

گہے آسماں گہَ زمیں کے ہیں یہ — جہاں بیٹھے جابس وہیں کے ہیں یہ

تو بھولی ہے جس بات پر اے بُوا[26] — خبر لے دوانی تجھے کیا ہوا؟

سنو جانی اپنے پہ کوئی مرے — تو دل پہلے اپنا بھی صدقے کرے

اگر آپ پر کوئی شیدا نہ ہو — تو پھر چاہیے اس کی پروا نہ ہو

وہ خوش ہوگا اپنی پری کو لیے — عبث[27] اُس پہ بیٹھی ہو تم جی دیئے

تمہاری اُسے چاہ ہوتی اگر — تو اب تک وہ تم کو نہ آتا نظر؟

لگی کہنے تب اُس کو بدرِ منیر — کہ سنتی ہے اب میری دختِ وزیر

کسی کی بدی تو نہ کر ، عیب ہے — کہ اس کا خدا عالمُ الغَیب[28] ہے

وہ اپنے دلوں سے تو ہے نیک ذات — ہوئی اُس پہ کیا جانے کیا واردات[29]

ہوا قید یا آنے پایا نہ وہ — گئے اتنے دن اب تک آیا نہ وہ

مجھے رات دن اُس کا رہتا ہے ڈر — پری نے سنی ہو نہ یاں کی خبر

نہ باندھا ہو اُس کو کسی صید[30] میں — کیا ہو نہ اُس کے تئیں قید میں

پرستان سے بھی نکالا نہ ہو — کسی دیو کے منہ میں ڈالا نہ ہو

---

[19] یاد دلانے لگی
[20] وزیر کی بیٹی
[21] سب کو
[22] عقل
[23] پیار
[24] ہندو فقیر
[25] یار دوست
[26] ایک عورت کا دوسری عورت کو مخاطب کرنے کا کلمہ
[27] فضول مُس
[28] غیب کا علم جاننے والا
[29] حادثہ واقعہ
[30] شکار

یہ کہہ حال دل ، اپنا رونے لگی گُہر[31] آنسوؤں کے پرونے لگی

گئی مُنڈکڑی[32] مار آخر کو لیٹ چھپرکھٹ[33] کے کونے میں سر منہ لپیٹ

انتخاب مرثیہ

شعباں کی ہے تاریخ سویم روزِ ولادت اور ہے دہم ماہِ عزا یومِ شہادت

دونوں میں بہر حال ہے تحصیلِ سعادت وہ بھی عمل خیر ہے یہ بھی ہے عبادت

مدّاح ہوں کیا کچھ نہیں اس گھر سے ملا ہے

کوثر ہے صلا اس کا بہشت اس کا صلا ہے

مقبول ہوئی عرض، گنہ عفو ہوئے سب امید بر آئی، مرا حاصل ہو مطلب

شامل ہوا افضالِ محمدؐ کرمِ رب ہوتے ہیں علم فوجِ مضامین کے نشاں اب

پستی پہ ہیں سب رکنِ رکیں دینِ متیں کے

ڈنکے سے ہلا دیتا ہے طبقوں کو زمیں کے

نازاں ہوں عنایت پہ شہنشاہِ زمن کی بخشی ہے رضا جائزہ فوجِ سخن کی

چہرے کی بحالی سے قبا چست ہے تن کی لو برطرفی پڑ گئی مضمون کہن کی

اِک فرد پرانی نہیں دفتر میں ہمارے

بھرتی ہے نئی فوج کی لشکر میں ہمارے

ہاں اے فلکِ پیر نئے سر سے جواں ہو اے ماہِ شبِ چار دہم نور فشاں ہو

اے ظلمتِ غم دیدۂ عالم سے نہاں ہو اے روشنیٔ صبحِ شبِ عید عیاں ہو

شادی ہے ولادت کی ید اللہ کے گھر میں

خورشید اترتا ہے شہنشاہ کے گھر میں

اے شمس و قمر، اور قمر ہوتا ہے پیدا نخلِ چمنِ دیں کا ثمر ہوتا ہے پیدا

مخدومۂ عالم کا پسر، ہوتا ہے پیدا جو عرش کی ضَو ہے، وہ گہر ہوتا ہے پیدا

ہر جسم میں جاں آتی ہے مذکور سے جس کے

نو نورِ خدا ہوں گے عیاں، نور سے جس کے

---

[31] موتی

[32] گھٹنوں میں سر دے لیٹنا

[33] وہ پلنگ جس کے اوپر چھتری ہو امیروں کے سونے کا بستر

اے کعبہ ایماں تری حرمت کے دن آئے　　اے رکنِ یمانی، تری شوکت کے دن آئے
اے بیتِ مقدس، تری عزت کے دن آئے　　اے چشمۂ زمزم، تری چاہت کے دن آئے
اے سنگِ حرم، جلوہ نمائی ہوئی تجھ میں
اے کوہِ صفاء، اور صفائی ہوئی تجھ میں

اے یثرب و بطحا، ترے والی کی ہے آمد　　اے رتبۂ عالی، شہ عالی کی ہے آمد
عالم کی تغیری پہ بحالی کی ہے آمد　　کہتے ہیں چمن، ماہِ جلالی کی ہے آمد
یہ خانۂ کعبہ کے مباہات کے دن ہیں
یعقوبؑ سے یوسفؑ کی ملاقات کے دن ہیں

یا ختم رسولؐ گوہر مقصود مبارک　　یا نورِ خدا رحمتِ معبود مبارک
یا شاہِ نجف شادیِ مولود مبارک　　یا خیر النساء اخترِ مسعود مبارک
رونق ہو سدا نور دوبالا رہے گھر میں
اس ماہِ دوہفتہ کا اجالا رہے گھر میں

اے اُمتیو! ہے یہ دمِ شکر گزاری　　ہر بار کرو سجدۂ شکریۂ باری
اللہ نے حل کر دیا مشکل کو تمہاری　　فردیں عملِ زشت کی اب چاک ہیں ساری
لکھے گئے بندوں میں ولی ابن ولی کے
ناجی ہوئے صدقے سے حسین ابن علیؑ کے

قصیدہ باب الجنت در منقبت حضرت علیؓ

اُٹھ گیا بہمن و دے کا چمنستاں سے عمل　　تیغِ اُردی نے کیا ملکِ خزاں مُستاصل

مشکل الفاظ: بہمن (ایرانی سال کا گیارہواں مہینہ جس میں برفباری ہوتی ہے) دی (ایرانی سال کا دسواں مہینہ) چمنستان (باغ) تیغ (تلوار) اُردی (ایرانی سال کا دوسرا مہینہ) عمل (عمل دخل، راج) ملکِ خزاں (خزاں کی سلطنت) مستاصل (فتح، جڑ سے اُکھیڑ ڈالنا)

سجدۂ شُکر میں ہے شاخِ ثمر دار ہر ایک　　دیکھ کر باغِ جہاں میں کرمِ عَزَّوَ جَل

مشکل الفاظ: شاخِ ثمر دار (پھل دار ٹہنی) کرم (مہربانی) عَزّو جل (عزت اور جلال والا، بزرگ و برتر)

قوتِ نامیہ لیتی ہے نباتات کا عَرض　　ڈال سے پات تلک پھول سے لے کر تا پھَل

مشکل الفاظ: قوتِ نامیہ (نشو و نما کی قوت) نباتات (زمیں سے اُگنے والی چیزیں) عرض (وسعت پھیلاؤ) ڈال (ٹہنی و شاخ) پات (پتا) تا (تک)

واسطے خِلعتِ نَوروز کے ہر باغ کے بیچ　　آبِ جُو قطع لگی کرنے رَوِش پر مَخمل

مشکل الفاظ: خِلعت (بیش قیمت لباس) نوروز (ایرانی سال کا پہلا دن جو 12 مارچ کو ہوتا ہے اس روز ایرانی خوشیاں مناتے ہیں، دوست احباب کو بلاتے اور ایسے کھانے جو سین سے شروع ہوں مہمانوں کے سامنے پیش کرتے ہیں) آبجو (ندی، نہر) قطع کرنا (کاٹنا) روش (باغ میں چلنے کا راستہ) مخمل (ایک قیمتی کپڑا)

عکس گُلبَن یہ زمیں پر ہے کہ جس کے آگے　　　کارِ نقاشیِ مانی ہے دُوَم وہ اوّل

مشکل الفاظ: گلبن (پھولداری ٹہنی) کار (کام) نقاشی (مصوری، نقش و نگار بنانا) مانی (ایران کا مشہورِ زمانہ اور بے نظیر مصور)

جوشِ روئیدگی خاک سے کچھ دُور نہیں　　　شاخ میں گاؤ زمیں کی ہے جو پھوٹی کونپل

مشکل الفاظ: روئیدگی (اُگنا) خاک (مٹی) شاخ (سینگ) گاؤ (گائے) کونپل (ننھی ننھی شاخیں)

فکر رہتی ہے مجھے یہ کہ زباں سے اپنے　　　کہیں دعوئے خدائی نہ کریں لات وہُبَل

مشکل الفاظ: لات و ہبل (دو بتوں کے نام جو اسلام سے پہلے خانہ کعبہ میں رکھے ہوتے تھے)

اور میرا سُخن ہے آفاق میں تا یومِ قیام　　　رہے گا سبز، بہرِ مجمع وہر یک دَنگل

مشکل الفاظ: سخن (شاعری) آفاق (افق کی جمع بمعنی زمانہ) یومِ قیام (قیامت کا دن) جمع (ہجوم) دنگل (چیلنج)

ہے مجھے فیضِ سخن اس کی ہی مدّاحی کا　　　ذات پر جس کے مُبرَہَن کُنہِ عَزَّوَجَل

مشکل الفاظ: فیضِ سخن (شاعری کا اعزاز) مداحی (تعریف) مبرہن (دلیل سے ثابت کیا ہوا) کنہ (حقیقت)

مہر سے جن کی منور رہے دل جُوں خُورشید　　　رُوسیہ کینے سے جس کے رہے مانند زُحَل

مشکل الفاظ: مہر (محبت و مہربانی) منور (روشن) جوں (کی طرح) خورشید (سورج) روسیہ (بدبخت) زُحل (ایک سیارہ جو سورج کے گرد گھومتا ہے اور منحوس خیال کیا جاتا ہے یہاں مراد بُری سوچ رکھنے والا شخص ہے)

شعلۂ شمع کی گرمی سے یقیں ہے دل پر　　　شب سے تا صبحِ قیامت نہ سکے موم پگھل
گر اسے کر کے بیاں سمجھوں، ثنا کی میں نے　　　خلق سمجھے گی دماغ اس کا ہوا ہے مُختل

مشکل الفاظ: مختل (پاگل پن)

جبہ سا جو کوئی در کا اسد اللہ کے ہے　　　کلۂ شیر کو روباہ کی نہ سمجھے پشکل

مشکل الفاظ: جبہ سا (پیشانی رگڑنا) اسد اللہ (اللہ کا شیر مراد حضرت علیؓ) کلۂ شیر (شیر کی کھوپڑی) روبہ (لومڑی) پشکل (مینگنی)

وصف تیرے کی ہے شایاں، زُباں تیری ہے　　　سمجھے تُو آپ کو یا تجھ کو خداوندِ اَجل

مشکل الفاظ: شایان (لائق) خداوند (مالک) اجل (موت، تقدیر)

طاقتِ طُولِ سُخن آگے بھی ٹک سودا کو　　　بخش اے قوتِ بازوئے نبیِ مُرسَلؐ

مشکل الفاظ: طول (بڑھانا) ٹک (ذرا) نبی مرسلؐ (بھیجا ہوا پیغمبر)

چاہتا ہے کرے آخر وہ دعائیہ پر　　　نظم تجھ مدح کی بہتر زکلامِ اوّل

مشکل الفاظ: زکلامِ اول (شروع سے ہی اپنی شاعری میں)

تا مُسمّی رہے یہ نظم بہ بابُ الجنّت　　　جب تلک اس سے بر آوے مری اُمید واہل

مشکل الفاظ: مسمی (اپنے نام کی طرح) باب الجنت (جنت کا دروازہ) تلک (تک) بر آوے (پورا ہو)

نخلِ اُمید سے تیرے ہوں بَرومَند مُحِب　　　ہو محبت نہ تری جن کو نہ پاویں وہ پھل

مشکل الفاظ: نخلِ امید (امید کا پودا) برومندی (مراد پوری ہونا، پھول لگنا) محبّ (دوست)